گرامچی

ذہن کی دنیا کا اسپارٹکس

اقبال اختر

انتونیو گرامچی

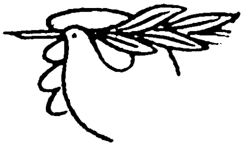

اَنتُونیو گرامچی

ذہن کی دُنیا کا سپارٹکس

اِقبال اختر

مکتبۂ دانیال

طبع اوّل : ۱۹۸۲ء
طابع : احمد برادرس
قیمت : بارہ روپے

ناشر
ملک نورانی، مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲، عبداللہ ہارون روڈ
کراچی

انتونیو گرامچی : ایک جائزہ اور سوانح حیات

ذہن کی دنیا کا سپارٹکس ۷

دس برس لمبی رات ۴۰

مضامین ۔ اقتباسات

مادیت پرستی کی لہر اور حاکمیت کا بحران ۵۹

انسان کیا ہے ۶۱

فلسفے اور تاریخی مادیت کا مطالعہ ۶۶

بے حسی ۸۰

عبقریوں کے وجود کا سلسلۂ عمل ۸۲

طبقہ، ریاست، پارٹیاں ۸۵

عضویاتی بحران کے ادوار میں سیاسی
پارٹیوں کے چند پہلوؤں کا جائزہ ۸۶

ذہن کی دنیا کا اسپارٹکس

اقبال اختر

نام : انتونیو گرامچی

پیدائش : ۲۲ر جنوری ۱۸۹۱ء

موت : ۲۷ر اپریل ۱۹۳۷ء

جنم اور انت کے درمیان چھیالیس سالہ زندگی پر محیط ایک نام ——— انتونیو گرامچی! مارکسی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھلی لینن کی ہمعصر ایک شخصیت ——— لینن کی ہی مانند مارکسی فکر و عمل کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی اہل ——— سنگین قدرت، سنگین تر غربت و افلاس اور سنگین ترین حالات کے استبداد کا شکار، لیکن نحیف و نزار جسم میں تخریبی و تعمیری عناصر سے مملو ایک زندہ اور باغی ذہن ——— تاریخ کی مادی جدلیات کا آئینہ دار، زمانۂ حال کی تاریک قوتوں سے برسر پیکار اور روشن مستقبل کے خوابوں سے سرشار ——— انتونیو گرامچی!

انتونیو گرامچی ——— جس نے اپنی مختصر، مگر جہد آزما زندگی کے دس سال فاشزم کی کال کوٹھریوں میں خون تھوکتے ہوئے بتائے، لیکن جس نے ان صعوبتوں کو محنت کش طبقے کے ایک سپاہی کی حیثیت سے خفیف ترین تاسف کے بغیر برداشت کیا۔ ذہن کی دنیا کا اسپارٹکس، گرامچی، جس نے فاشزم کی کال کوٹھریوں کی دبیز تاریکی میں نہ صرف اپنے ذہن کی روشنی کو قائم و دائم رکھا، بلکہ جس نے بے رحم تاریک قوتوں کے خلاف اپنے ذہن کو ایک مشعل کی صورت جلائے رکھا۔

مارکسی فکر و دانش کی یہ مشعل آج بھی ان گنت ذہنوں کے نہاں خانوں کو منور کر رہی ہے۔

جزیرۂ سار دینیا کا فرزند، اٹلی کا باشندہ، دنیا کا شہری، عالمی محنت کش طبقے کا غمخوار، دوست اور رہبر!

اٹلی کا جنوبی خطہ چند تاریخی عوامل کی وجہ سے ہمیشہ پسماندگی اور افلاس کا شکار رہا ہے۔ اس خطے کی معیشت زراعت پر مبنی ہے۔ جزیرۂ سار دینیا بھی اسی افلاس زدہ جنوبی خطے کا ہی ایک حصہ ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۹۱ء کو جب انتونیو گرامچی نے سار دینیا کے ایک گاؤں، گلزارا میں مقامی سررشتے دار کے دفتر میں کلرک، سیلو گرامچی کے گھر میں جنم لیا تو اس وقت اٹلی کا پورا جنوبی حصہ شمال کے سرمایہ داروں کی حامی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے ایک کمر توڑ معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ انتونیو گرامچی سیلو اور اس کی بیوی پیپینا کی چوتھی اولاد تھا۔ انتونیو سے پہلے اوپر تلے تین اولادیں ہو چکی تھیں، جن میں سے دو لڑکیاں تھیں اور ایک سب سے بڑا لڑکا۔ انتونیو کی پیدائش کے ایک سال بعد سیلو کا تبادلہ سار دینیا کے ہی ایک اور گاؤں، سار گونو میں ہو گیا، جہاں اگلے پانچ برسوں کے دوران، خاندان کے افراد میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا اور اضافہ ہو گیا۔

۱۸۹۷ء میں پورے اٹلی کے ساتھ سار دینیا میں بھی عام انتخابات ہوئے، جن میں مختلف سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ ان پارٹیوں نے خود پر مختلف سیاسی نظریات کے لیبل چسپاں کر رکھے تھے، لیکن اصلیت یہ تھی کہ ان دنوں سیاسی جماعتوں کی اساس چند علاقائی مقتدر ہستیاں ہوتی تھیں، جو اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کے حصول اور تحفظ کی خاطر کوئی بھی ایسا سیاسی لیبل چن لیتی تھیں، جس سے فی الوقت فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو۔ ان علاقائی آمروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اقتدار کے قلعے کھڑے کر رکھے تھے۔ اکثر لوگ ان حلقہ بندیوں کی پاسداری کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ لیکن سیلو نے سار گونو میں قیام کے دوران اپنی سیاسی وفاداری ایک ایسے سیاست داں کے ساتھ وابستہ کر لی، جو ایک گھاگ مقامی آمر کو اکھاڑنے کی نیت سے انتخابی اکھاڑے میں کودا تھا۔ لیکن وہ گھاگ مقامی آمر خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والے نوسکھیے سیاست داں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا اور اس کے ساتھ ہی سیلو بھی اس مقامی آمر کے انتقام و عتاب کا شکار ہو گیا۔

سیلو کو اپنے بڑے بھائی کی اچانک موت کی وجہ سے کچھ دن کے لیے ایک قریبی گاؤں جانا پڑا۔ دشمن نے اس کی اس مختصر سی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا۔ جب سیلو سار گونو واپس آیا تو دشمن اپنا جال پھیلا چکا تھا۔ سیلو پر دفتر کے حساب کتاب میں خرد برد کرنے کا الزام عائد کر کے معطل کر دیا گیا اور اس کی تنخواہ بھی روک لی گئی۔ سیلو اپنے گھر بار سمیت گلزار گاؤں واپس آ گیا، لیکن گرفتاری کا خوف ایک تلوار بن کر اس کے سر پر لٹکا ہوا تھا۔ چند مہینے سیلو نے اسی تلوار کے سائے میں بتائے۔ آخر یہ تلوار چند مہینے بعد سیلو کے سر پر گری اور پولیس نے اسے خرد برد کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس وقت سیلو کی عمر ۳۸ سال تھی۔ گرفتاری کے پندرہ مہینے بعد سیلو کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی اور یہ سماعت بھی ایک سال تک جاری رہی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو عدالت نے بتینہ طور پر خرد برد کی گئی رقم کو قلیل و حقیر دینے کے باوجود، سیلو کو

پانچ سال آٹھ مہینے، بائیس دن کی کڑی سزا دی۔

باپ کی گرفتاری کے وقت انتونیو صرف سات سال کا تھا اور اُس وقت سب سے چھوٹا بچہ پیپنا کی گود میں تھا، سب سے بڑے لڑکے گنّارو کی عمر چودہ سال تھی۔ سسیلو کی گرفتاری اور لمبی سزا پیپنا اور اس کے سات بچوں کے لیے لامتناہی مصائب کے دور کا آغاز بن گئی۔

مصائب کے اسی دور میں انتونیو کی کمر کو بڑھ نکلنا شروع ہوا۔ اُس وقت تک انتونیو دبلا پتلا لیکن صحت مند بچہ تھا، لیکن اس کے جسم کی ساخت میں اس اچانک تبدیلی نے پیپنا کو مزید وحشت و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ پیپنا نے لیپ اور مالش سے لے کر باقاعدہ علاج تک کا سہارا لیا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور کمر کے ساتھ ساتھ انتونیو کے سینے پر بھی اُبھار نکلنے لگا۔ بعد میں پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ ایک بار ایک خادمہ کے ہاتھ سے انتونیو چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ بچپن میں ہی شاید خادمہ کے ہاتھوں سے گرنے کے بعد ہی، انتونیو کو تین دن تک خون کی قے دست ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے اظہار مایوسی کے باوجود انتونیو کی جان کسی طرح بچ گئی تھی، لیکن سات سال کی عمر میں بچپن کی یہ چوٹ کوبڑ کی صورت میں ظاہر ہونے لگی۔

عورت کو صنفِ نازک کہا جاتا ہے، لیکن جب مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو یہی صنفِ نازک تمام آفات کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر ہر آفت کو جھیل جاتی ہے۔ آفات کے گھیرے اور حالات کے اندھیرے میں پیپنا کی یہی مردانہ خصوصیت اُبھر کر سامنے آئیں اور وہ اپنے سات بچوں کو تمام آفات سے بچانے کے لیے اور انھیں سر لینے کے لیے برسرِ پیکار ہو گئی۔ معاشی مصائب اور انتونیو کے اچانک ظہور پذیر ہونے والے عارضہ نے پیپنا کو ہراساں تو کیا، مگر مایوس نہیں۔ معاشی مصائب کا مقابلہ پیپنا نے ترکہ میں ملے ایک قطعہ اراضی کو بیچ کر اور ساتھ ہی سلائی کڑھائی سے حاصل ہونے والی قلیل آمدنی کے ذریعہ کیا۔ پیپنا نے کسی رشتے دار سے مدد لینا بھی پسند نہ کیا اور مادرانہ غیرت و خودداری نے اُسے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دی۔ انتونیو کے عارضہ کے علاج کے لیے بھی پیپنا نے انتھک کوشش کی۔ لیکن جہاں پیپنا سات جانوں کو معاشی آفات سے کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہوئی، وہاں اُسے قدرت کے اس استبداد کو قبول کرتے ہی بنی، جس کا نشانہ سات سالہ انتونیو بنا تھا۔ انتونیو کا یہ عارضہ اُس کا عمر بھر کا ساتھی بن گیا۔

ساڑھے سات سال کی عمر میں انتونیو کے ذہنی سفر کی شروعات ہوئی اور اسے گلرزا کے ثانوی میں اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس ابتدائی دور میں ہی انتونیو کے ذہن کے جوہر کھلنے اور کھلنے لگے۔ حرف شناسی اور لفظ شناسی کے مراحل طے کرتے ہی ننھے انتونیو کے ذہن میں لفظوں کے لیے وہ بھوک بیدار ہو گئی، جو الفاظ کے معنی و مطالب کی تلاش کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ لیکن انتونیو کی یہ ذہنی بھوک معنی و مطالب کی تلاش پر ہی ختم نہیں ہوئی، بلکہ آگے چل کر انتونیو نے ان معنی و مطالب کو عمل کے قالب میں ڈھالنے کا جتن کیا۔

تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی انتونیو ہر موضوع میں دس میں دس یا نو نمبر لاتا تھا۔ ذہنی توانائی کے ساتھ انتونیو نے عملی توانائی کے جوہر بھی دکھلانے شروع کر دیے۔ وہ کھلونے، کشتیاں اور گاڑیاں بنانے میں کافی مہارت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ایک بار انتونیو نے کاغذ کی ایک اتنی خوبصورت ناؤ بنائی کہ گاؤں کے لوہار نے اُس ناؤ کے ماڈل پر ٹین کی کشتیاں بنا کر بیچیں۔

انتونیو کو اپنی جسمانی کمزوری کا احساس تھا اور اپنی اس کمزوری کو دُور کرنے کے لیے اس نے کسرت کرنا شروع کر دی۔ ایک ڈنڈی کے دونوں کونوں پر اس نے پتھر تراش کر اچھی طرح فٹ کر دیے اور وہ روزانہ وزن اُٹھا کر اس کمزوری کی تلافی کرنے کی کوشش کرنے لگا، جو کسی کمزور قوتِ ارادی کے فرد کو عمر بھر کے لیے اپاہج بنا سکتی تھی۔

بچپن کے اس دور میں انتونیو اکثر اپنے ہم جماعتوں سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا لیکن جب اُس کے ہم جماعت اُس سے کھُل کر ملتے تھے تو وہ بھی اُن میں گھُل مِل جاتا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں میں وہ اپنے سے چار برس چھوٹی بہن ترلیسینا سے بہت لاڈ پیار کرتا تھا اور اپنے جیب خرچ کے چند پیسوں میں سے بھی اُس کو تصویری رسالے خرید کر دیتا تھا۔

لیکن انتونیو کے معصوم ذہن پر معاشی مصائب کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ غربت کو ایک بھوکے ننگے بچے سے مخفی نہیں رکھا جا سکتا ——— پیپینا نے بچوں کو اُن کے باپ کی غیر حاضری کے سبب سے انجان رکھنے کی کوشش کی لیکن کسی بھی چھوٹے سے گاؤں میں اتنی بڑی خبر کو چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی بھی ایسی خبر کوٹھوں چڑھ کر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ انتونیو کے کانوں میں اپنے باپ کی حراست اور سزا کے بارے میں یہ خبر بات کا بتنگڑ بن کر پہنچی اور اس کے معصوم ذہن میں ایک اتھل پتھل سی مچ گئی۔ وہ اور زیادہ تنہا اور سب سے زیادہ الگ تھلگ ہو گیا۔

لیکن سچائی کو پوشیدہ رکھنے کی اس کوشش نے انتونیو کے ذہن پر ایک متضاد اثر مرتب کیا اور وہ ہر قیمت پر سچائی جاننے کا متلاشی بن گیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انتونیو گرامچی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں اس کی حقیقت جاننے کی خواہش بار ہا ماں سے تکرار کا سبب بن جاتی تھی۔

پیپینا اور اس کے سات بچوں پر افلاس کی مار اتنی زبردست تھی کہ انتونیو کی بہنیں موم بتیوں کے پگھلے ہوئے موم سے موم بتیاں بنایا کرتی تھیں، تاکہ ان موم بتیوں کی دھندلی روشنی میں انتونیو اسکول کا کام پورا کر سکے۔ ۱۹۰۲ء میں انتونیو نے تیسری جماعت میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور گرمی کی چھٹیوں میں جب اس کی عمر گیارہ سال تھی، وہ اپنے بڑے بھائی گنارو کے ساتھ مقامی سررشتے دار کے دفتر میں کام کرنے لگا جو پہلے سے ہی اس دفتر میں کام کر رہا تھا۔ انتونیو کا کام اپنے وزن سے بھاری رجسٹر اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا تھا۔ کمزور صحت کے باوجود اس بھاری جسمانی مشقت نے انتونیو کے جسم و ذہن پر بُرے اثرات مرتب کیے۔

اگلی جماعت میں بھی انتونیو امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوا اور اس نے مضمون نویسی، املا، ریاضی، گرامر، تاریخ اور جغرافیہ میں سے ہر ایک موضوع میں سے دس میں سے دس نمبر حاصل کیے۔ لیکن ثانوی مدرسے کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد حالات نے انتونیو کو تعلیم کا سلسلہ اُس وقت تک ترک کرنے پر مجبور کر دیا، جب تک اس کا باپ جیل سے رہا ہو کر باہر نہیں آتا۔ اس مجبوری نے انتونیو کے ذہن میں بغاوت کی پہلی چنگاری کو جنم دیا، کیونکہ اس کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی کہ قصائی، درزی، حجام تک کے لڑکے اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھ سکتے تھے جبکہ وہ ابتدائی تعلیم امتیازی شان سے مکمل کرنے کے باوجود سلسلۂ تعلیم ترک کرنے پر مجبور تھا۔ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ترک کرنے کے باوجود، انتونیو نے اپنے طور پر لاطینی سیکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ سررشتے دار کے دفتر میں کمر توڑ مشقت بھی کرتا رہا۔

جنوری ۱۹۰۴ء میں انتونیو کا باپ جیل سے رہا ہونے کے بعد گھر واپس آیا اور اس بھرے پُرے گھر بار پر چھائے ہوئے مصائب کے بادل کسی حد تک چھٹ گئے، حالانکہ اس وقت پورے جنوب اور سارڈینیا کے معاشی حالات بحران سے ابتری کی طرف رواں دواں تھے۔ معاشی ابتری کی وجہ سے لٹیروں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ دوسری طرف کانوں میں کام کرنے والے مزدور منظم جدوجہد کر رہے تھے۔ ستمبر کے مہینے میں فوج نے ہڑتالی کان کنوں پر گولی چلا کر تین کان کنوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے خلاف اٹلی میں مُلک گیر ہڑتال ہوئی۔

سسیلو کی واپسی کے بعد کچھ عرصہ تک تنہا کمانے اور کھلانے والا فرد انتونیو ہی تھا، کیونکہ سسیلو لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتا تھا۔ انتونیو کا بڑا بھائی گنارو فوجی تربیت کے لیے جا چکا تھا، جبکہ چھوٹا بھائی بھی ثانوی تعلیم کے بعد مذہبی تعلیم کے لیے

ایک درس گاہ میں داخل ہوچکا تھا۔ پیپینا کڑھائی سلائی اور اس کی دو بیٹیاں بُنائی کرکے گھر کا چولہا گرم رکھنے میں مدد دیتی تھیں، لیکن گاؤں کے لوگوں نے سسیلو کی ہچکچاہٹ کو جلد ہی دُور کردیا، کیونکہ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے بے قصور سزا بھگتی تھی۔ سسیلو لوگوں میں گھُل مل گیا اور اس کے لیے روزی روٹی کے دروازے بھی کھُل گئے۔ پہلے اس نے دو ایک چھوٹے موٹے کام کیے۔ بعد میں سسیلو مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں قانونی صلاح کار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

آمدنی اب بھی قلیل تھی، لیکن اب کھینچ تان کر گزارہ چلایا جاسکتا تھا۔ سسیلو اور پیپینا نے قلیل آمدنی کے باوجود انتونیو کے سلسلۂ تعلیم کو ازسرِنو شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انتونیو کو گلرزا سے اٹھارہ میل دُور ایک سیکنڈری اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ یہ اسکول تعلیم کے میدان میں ایک مثال قائم کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، مگر بدانتظامی کی ایک مثال بن کر رہ گیا تھا، لیکن اس بدانتظامی کے باوجود انتونیو نے نہایت ذوق وشوق اور لگن سے تحصیلِ علم کا سلسلہ شروع کردیا۔ وہ پیر سے سنیچر تک اسکول میں رہتا اور سنیچر کو گھر واپس آتا اور پیر کو اسکول واپس چلا جاتا۔

پیپینا کھانے پینے کا جو سامان اس کے ساتھ کرتی تھی، انتونیو اکثر وہ سامان بیچ کر کتابیں رسالے خرید لیتا تھا۔ پیپینا اس پر ناراض ہوتی اور سسیلو بھی اُس پر گرم ہوتا۔ سسیلو کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ انتونیو نے اُلٹی سیدھی کتابیں، رسالے پڑھنے شروع کردیے تھے۔ یہ کتابیں، رسالے گنّارو میلان سے اپنے بھائی کے لیے بھیجتا تھا ــــــــــ اور ان سب کا ایک ہی موضوع ہوتا تھا ــــــــــ سوشلزم۔ لیکن سسیلو اپنی غربت کے باوجود، خود کو کسی حد تک شاہی خاندان کا فرد سمجھتا تھا، کیونکہ اس کے بڑے بھائی کو اٹلی کے مستقبل کے فرماں روا نے اپنی فوجی تربیت کے دوران ایک گھوڑا بطورِ تحفہ پیش کیا تھا اور اس گھوڑے کا فوٹو سسیلو کے گھر میں بڑی شان کے ساتھ دیوار پر ٹنگا رہتا تھا!

۱۹۰۸ء میں انتونیو نے سیکنڈری کا اسکول کا آخری امتحان پاس کرلیا۔ بدنظمی کی وجہ سے انتونیو کی پڑھائی بھی متاثر ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود، انتونیو نے تاریخ کے مضمون میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ اُس وقت انتونیو کی عمر ساڑھے سترہ سال تھی۔

اس پورے عرصے میں، سارڈینیا کی معاشی ابتری اور اس کے ساتھ ساتھ کان کنوں کے بے رحمانہ استحصال کی وجہ سے پورے جزیرہ میں افراط وتفریط کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ کانوں میں کام کرنے والے پندرہ ہزار مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان مزدوروں کی اکثریت کسانوں اور گلّہ بانوں پر مشتمل تھی، جنھیں زرعی بحران نے کانوں میں کام تلاش کرنے پر مجبور کردیا تھا، جہاں انھیں صبح چھ بجے سے شام پانچ بجے تک مشقت کرنا پڑتی تھی۔ مزدوری نہایت قلیل ملتی تھی اور وہ بھی ہر دو تین مہینے۔ اس دوران انھیں کمپنیوں کی دُکانوں سے اُدھار سودا سلف خریدنا پڑتا تھا اور یہ سامان بھی انھیں بازار سے مہنگے داموں پر ملتا تھا۔ یہ مزدور جن گندی بستیوں میں رہتے تھے، وہ سؤر کے باڑوں سے زیادہ متعفن تھیں۔ اکثر مزدوروں کو دق یا ایسی ہی دوسری موذی بیماریاں لاحق تھیں، لیکن کمپنیاں انھیں بیمار تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتی تھیں اور نہ مزدور ہی نوکری چھوٹنے کے ڈر سے اپنی بیماری کی اصلیت ظاہر کرنے پر تیار ہوتے تھے۔ ان حالات کا نتیجہ منظم اور غیر منظم مزدوروں کے منظم اور اکثر غیر منظم اُبال ہڑتالوں اور پولیس اور فوج سے خونی تصادموں کی صورت میں نکلتا تھا۔

۱۹۰۸ء میں قریب اٹھارہ سال کی عمر میں انتونیو نے اسکول چھوڑ کر کالج اور شہر کا رُخ کیا۔ انتونیو نے کالیاری کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ سال کے اواخر میں اس کے والدین نے گنّارو کا تبادلہ کالیاری کے ہی سرشتے دار کے دفتر میں کرادیا، تاکہ دونوں بھائی اکٹھے رہ سکیں۔ (اسی سال گنّارو اپنی فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد واپس آچکا تھا) لیکن گنّارو نے سرشتے دار کے

دفتر کی نوکری چھوڑ کر ایک آئس فیکٹری کا بہی کھاتہ سنبھال لیا۔

کالیاری چھوٹا سا شہر تھا، مگر پھر بھی شہر تھا، جہاں مین روزنامے شایع ہوتے تھے۔ کچھ رسالے بھی نکلتے تھے جن میں ایک سوشلسٹ ہفتہ وار بھی شامل تھا۔ شہر میں دو تھیٹر بھی تھے، جہاں باقاعدگی کے ساتھ ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ سینما بھی اپنے قدم جمارہا تھا۔ شہر میں کئی لیکچر ہال بھی تھے۔ شہر کی زندگی کی ان دلچسپیوں نے انتونیو کی توجہ اپنی طرف کھینچی، مگر انتونیو کی توجہ کا مرکز تحصیلِ علم ہی بنا رہا۔ انتونیو کو تحصیلِ علم کا کتنا شغف تھا، وہ ان متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، جو وہ اپنے باپ کو لکھا کرتا تھا۔ انتونیو اکثر دوسرے طلبا سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا اور اس کا زیادہ وقت مطالعے میں ہی صرف ہوتا تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً وہ طلبا کی محفلوں میں بھی شامل ہوتا تھا اور ان کے ساتھ خوش گپیوں کا لطف اٹھاتا تھا۔

انتونیو کے الگ تھلگ رہنے کی ایک وجہ اس کی تنگ دستی بھی تھی۔ اکثر اُس کی جیب اور ہاتھ خالی ہی رہتے تھے۔ وہ باپ کے نام لکھے گئے خطوط میں بار بار اپنی اس تنگ دستی کا تذکرہ کرتا تھا۔ گنارو اس کی مدد کرتا تھا، مگر گنارو کی تنخواہ دونوں کے گزارے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ کپڑوں کے دو ایک جوڑوں میں ہی اُسے پورا سال گزارنا پڑتا تھا ——— لیکن ان تمام نامساعد حالات نے بھی انتونیو کی تحصیلِ علم کی پیاس کو سرد نہ کیا اور وہ تندہی کے ساتھ نصابی کتابوں کے علاوہ، کتابوں، رسالوں اور روزناموں سے علم کی اس پیاس کو سرد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہی ایک ایسی تشنگی ہے، جو کبھی آسودہ نہیں ہوتی۔ علم کی یہ پیاس ہی انتونیو کو کارل مارکس کے سرچشمۂ فکر تک پہنچانے کا سبب بن گئی۔ ساتھ ہی انتونیو اپنے گرد و پیش کی دُنیا کے بارے میں بھی پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ وہ مقامی مسائل میں بھی گہری دلچسپی لینے لگا۔

اُس وقت جنوبی اٹلی کی پسماندگی کا مسئلہ سارڈینیا کے اخبارات میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ گرامچی کا ایک استاد، رفا گارزیا ''لے یونین سارڈا''، نام کا ایک اخبار نکالتا تھا، جس کے صفحات جنوبی اٹلی کی غربت، خصوصاً سارڈینیا کی غربت کے مسئلہ پر دھواں دھار مضامین کے لیے وقف تھے۔ گرامچی گارزیا کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ گارزیا اطالوی ادبیات پڑھاتا تھا۔ ادب سے متعلق گرامچی کے مضامین کی گارزیا کی نظر میں اتنی وقعت و اہمیت تھی کہ وہ ان مضامین کو بطورِ مثال پوری کلاس کے سامنے بہ آوازِ بلند سُناتا تھا۔ گارزیا نے گرامچی کو اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ کچھ عرصے میں استاد اور شاگرد کے درمیان اس ذہنی رفاقت نے دوستی کی صورت اختیار کر لی۔

موسمِ گرما کی تعطیلات میں گھر جانے سے پہلے گرامچی نے گارزیا کے اخبار کے لیے خبریں بھیجنے کے بارے میں بات کی، لیکن گلزا میں پہلے ہی سے اخبار کا ایک نمائندہ موجود تھا۔ اس لیے رفا گارزیا نے گرامچی کو ایک اور قریبی قصبہ، آئیدو میگورے کی، خبریں بھیجنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۱۰ء کو گارزیا کے اخبار میں گرامچی کی یہ پہلی رپورٹ شایع ہوئی، جس میں اختصار کے باوجود، طنزیہ عنصر نمایاں تھا:

قرب و جوار کے قصبات میں یہ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ چناؤ کے وقت آئیدو میگورے میں نہایت حیرت انگیز اور دہشت ناک واقعات ظہور پذیر ہوں گے لوگ کسی بھی انتہا پسند اقدام پر اتارو اور ایک ہی وار میں مکمل رائے دہندگی کا حق حاصل کرنے اور حقیقتاً میئر اور کونسلروں کا چناؤ خود کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ گلزا اپولیس کے لیفٹیننٹ کو یہ علامات دیکھ کر گہری تشویش لاحق ہوئی اور اس

نے ایک پورا فوجی دستہ وہاں تعینات کر دیا۔ چالیس مسلح سپاہی اور چالیس فوجی ———— خیریت گزری کہ وہ توپ خانے سے لیس نہیں تھے ———— اور ایک پولیس مین (جس کا وجود بجائے خود کافی و شافی ہوتا) جب ووٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گرفتاری کے خوف سے ان لوگوں نے، جنہیں ووٹ دینے کا حق تھا اور ان لوگوں نے بھی جنہیں ووٹ دینے کا حق نہیں تھا، خود کو اپنے گھروں میں بند کر لیا اور حکام رائے دہندگان کو پکڑ پکڑ کر ان کے گھروں سے باہر نکالنے پر مجبور ہو گئے . . . "

گرامچی تعطیلات کے بعد تیسرے سال کی پڑھائی شروع کرنے کالیاری واپس پہنچا تو وہاں کی سیاسی فضا میں کافی گرما گرمی تھی۔ حکومت وقت برابر شمالی اٹلی کے صنعت کاروں کے مفادات کو بڑھاوا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور اس پالیسی کی وجہ سے زراعت پیشہ جنوبی اٹلی کی معاشی بدحالی ———— بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ سارڈینیا میں وبائی امراض کا بھی زور تھا۔ سارڈینیا کے اخبارات میں اس صورت حال پر کھل کر احتجاج کیا جا رہا تھا اور جنوبی اٹلی سے مرکزی حکومت کے سوتیلے سلوک پر کڑی نکتہ چینی کی جا رہی تھی۔ اس فضا میں پارلیمنٹ کے سوشلسٹ رکن، گوئیڈو پودریکا کی سارڈینیا میں آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پودریکا پادری شاہی کا کٹر مخالف تھا۔ وہ ایک اخبار بھی شایع کرتا تھا جس میں پادری شاہی پر سخت ترین حملے کیے جاتے تھے۔

پادری شاہی کے موافقین کی کوششوں کے باوجود سوشلسٹ رکن پارلیمنٹ کا یہ دورہ نہایت کامیاب رہا۔ پودریکا نے کالیاری چیمبر آف لیبر اور سوشلسٹ پارٹی کے زیر اہتمام کئی جلسوں میں پادری شاہی اور محنت کش طبقے کے موضوعات پر تقاریر کیں۔ کالیاری چیمبر آف لیبر اس وقت مزدوروں، پیشہ وروں اور دانشوروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گرامچی کا بڑا بھائی گنارو اکثر اور گرامچی کبھی کبھی اس کے ساتھ چیمبر آف لیبر کے دفتر میں جاتا تھا۔ پولیس دفتر میں آنے جانے والوں کی کڑی نگرانی کرتی تھی اور نوجوان اس خطرے کے باوجود بلکہ بعض اوقات اس خطرہ کی وجہ سے ہی چیمبر آف لیبر میں آنا جانا ہمت کا کام سمجھتے تھے۔ گنارو چیمبر آف لیبر کا خزانچی چن لیا گیا تو انتونیو کا وہاں اکثر آنا جانا ہو گیا۔

پولیس نے گنارو کے پس منظر کے بارے میں چھان بین شروع کی تو اس کے ماں باپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ باپ تو نہایت برافروختہ ہوا اور اس نے کالیاری جا کر خود گنارو کی سرگرمیوں کی چھان بین کرنے کی سوچی، لیکن انتونیو نے یہ خط لکھ کر باپ کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی:

"خدا معلوم آپ کیا تصور کر بیٹھے ہیں: ننارہ[1] جیل میں ہے یا ننارہ کو چار مسلح سپاہی خدا مان خدا مان لیے جا رہے ہیں۔ بے فکر رہیے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ننارہ نے چیمبر آف لیبر کی کچھ ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ پولیس کی ناک کے نیچے ایک نیا نام آیا تو اس نے اس "خون کے پیاسے انقلابی" کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، جو اچانک ابھر کر سامنے آیا تھا۔ سمجھے آپ؟ بس اتنی سی بات تھی۔ اس میں

---

[1] گنارو کا پیار کا نام۔

کِسی کا کوئی نُقصان نہیں ہے۔ یہاں ایک ہڑتال ہوئی تھی اور چونکہ فسٹارو جیمبر کا خزانچی ہے، اِس لیے پولیس نے خزانے پر قبضہ کرنے اور ہڑتال ختم کرانے کے لیے اس کا پتہ جاننے کی کوشش کی، لیکن ہڑتال واپس لے لی گئی اور خزانہ پر پولیس کا ہاتھ نہیں پڑا۔۔۔ آگے کبھی ایسی بات ہو تو خاطر جمع رکھیے اور پوچھ گچھ کرنے والے پولیس مین کے سامنے کھل کر ہنسیے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ یہ بیچارے ——— ! مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔ ان کے سروں پر سوشلسٹوں اور مزاجیوں کا بھوت ایسا سوار رہتا ہے کہ انہیں اُٹھائی گیروں اور غنڈوں کی فکر کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا اور یہ بیچارے اِس خوف کے مارے دبک دبک کر چلتے ہیں کہ کوئی اُن کا ٹوپ نہ لے جائے۔۔۔ "

اُس وقت گرامچی کی عمر بیس سال تھی اور وہ شہر کی زندگی میں رچ بس گیا تھا ——— وہ حتی المقدور شہر کی دلچسپیوں سے لُطف اندوز ہونے کی بھی کوشش کرتا تھا، لیکن معاشی حالات نے اس کے ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے۔ گنارو کی تنخواہ اور گھر سے آنے والے پیسے دونوں بھائیوں کے گزارے کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک جگہ گرامچی لکھتا ہے: " پیسے بچانے کی خاطر پہلے تو میں نے صبح کافی پینا بند کر دیا۔ اور دوپہر کا کھانا بھی بہت دیر میں کھانے لگا، تاکہ رات کا کھانا کھانے کی ضرورت نہ رہے۔ اس طرح آٹھ مہینے تک میں صرف ایک وقت ہی کھاتا رہا اور اس کا ہی نتیجہ تھا کہ میں نے کالج کا تیسرا سال ختم کیا تو میں غذائیت کی کمی کی وجہ سے سخت جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔"
اُس وقت گرامچی کی ذہنی نشوونما کیا تھی، اس کا اندازہ اُس کے اُس مضمون سے لگایا جا سکتا ہے، جو اُس نے نوآبادیاتی نظام اور محکوم عوام کے بارے میں "لے یونین سارد ا" میں سپردِ قلم کیا تھا:

"ایک دن یہ خبر ملتی ہے کہ کسی طالبِ علم نے ہندوستان کے انگریز گورنر کو ہلاک کر دیا یا کسی دن یہ خبر آتی ہے کہ ڈوغالی کے مقام پر اطالویوں کو مار ڈالا گیا یا باکسر باغیوں نے یورپین مشنریوں کا صفایا کر دیا۔ بس، پھر کیا ہے، پورا پُرانا یورپ وحشیوں، غیر مہذب محکوموں کو صلواتیں سنانے لگتا ہے اور ان بیچارے محکوم عوام کے خلاف ایک نئے جہاد کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔۔۔ یہ جنگیں تجارت کے لیے لڑی جاتی ہیں، تہذیب کے لیے نہیں۔ جب چینیوں نے انگریزوں کی افیم خریدنے سے انکار کر دیا تھا تو انگریزوں نے چین کے کتنے شہروں کو تاراج کر دیا تھا؟ اسے کہتے ہیں تہذیب! روسیوں اور جاپانیوں نے کوریا اور منچوریا کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے ہی ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہایا تھا۔"

گرامچی نے یہ مضمون روس میں انقلاب سے چھ سال قبل، ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا۔ مضمون کے آخیر میں گرامچی نے یہ نتیجہ

اخذ کیا تھا کہ جب تک یورپ کا محنت کش طبقہ اقتدار پر قابض نہیں ہوتا، نوآبادیوں کے محکوم عوام پر تہذیب کے نام لیوا ظلم ڈھاتے رہیں گے۔

گرامچی نے اسی سال کافی امتیازی شان کے ساتھ کالج کی پڑھائی ختم کرلی۔ اب اس کے سامنے مزید تعلیم جاری رکھنے کا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ تورین یونیورسٹی سارڈینیا کے ۳۹ غریب طلبا کو ستر لیرے ماہوار کی اسکالرشپ دیتی تھی، لیکن اسکالرشپ کے لیے ضروری تھا کہ وہ طلبا ایک بار پھر ان مضامین کا امتحان دیں، جو انھوں نے کالج میں پڑھے تھے۔ گرامچی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خرابیٔ صحت کے باوجود، وہ ایک بار پھر اسکالرشپ کے لیے امتحان دے۔ گرامچی لمبا سفر طے کرکے نہایت ہلکی جیب اور خراب صحت کے ساتھ بڑے صنعتی شہر، تورین پہنچا تو پرشور شہر نے اُسے حواس باختہ کردیا۔ لیکن وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور دو تین بار غشی کے دورے پڑنے کے باوجود، وہ پاس ہونے والے طلبا کی فہرست میں نویں نمبر پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ فہرست میں دوسرا نام پالمیرو تولگلیاتی کا تھا، جو سارڈینیا کے ہی ایک کالج سے امتحان دینے آیا تھا۔ یہ وہی تولگلیاتی تھا، جو بعد میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بن کر اُبھرا، لیکن ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بعد میں قائم ہوا۔

تورین یونیورسٹی میں داخلہ ملنے کے بعد گرامچی نے ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا، لیکن اب اُسے تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ پھر اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے اس نے جو مشقت کی تھی، اس نے بھی اس کی کمزور صحت کو مزید نحیف و نزار بنادیا تھا۔ گرامچی اُس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے: "۱۹۱۱ء میں سردی اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے میری صحت اتنی خراب تھی کہ مجھے ہر وقت یہ وہم ڈسنے لگا تھا کہ رات کو جب میں سو جاؤں گا تو ایک عظیم الجثّہ مکڑی رات کے اندھیرے میں اپنے جال سے نکلے گی اور میرا مغز چاٹ جائے گی۔"

یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد بھی تنگدستی ایک جونک کی طرح گرامچی سے چمٹی رہی، کیونکہ اسکالرشپ کے ستر لیرے گذارے کے لیے ایک دم ناکافی تھے۔ اس تنگ دستی کا اندازہ، ان خطوط سے ہوتا ہے، جو گرامچی گھر لکھا کرتا تھا:

"... اس مہینے مجھے کالج سے صرف ۶۲ لیرے ملے ہیں، جن میں سے چالیس میں نے گھر کی مالکن کو دے دیے اور ۲۰ اور جلد ہی اُسے دینے ہیں۔ بہرکیف، اس بار کرسمس بڑا کڑا گزرے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کڑاکے کی سردی میں میں کسی اور بل کی تلاش میں سارے تورین میں مارا مارا پھروں۔ نانا نے مجھے جو دس لیرے بھیجے ہیں، ان سے میں ایک اوور کوٹ بنوانے کی سوچ رہا تھا۔ اب خدا معلوم اس میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سردی سے کپکپاتے کانپتے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانا اور پھر یخ بستہ ٹھنڈے کمرے میں واپس آنا اور گھنٹوں سردی سے کانپتے رہنا کتنا خوشگوار ہوتا ہوگا۔ اگر مجھے ان تکالیف کا پہلے سے علم ہوتا تو منجمد کردینے والی یہ زندگی جھیلنے یہاں ہرگز نہ آتا ــــــــ کسی قیمت پر بھی نہیں! سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سردی کی فکر کرتے رہنے کی وجہ سے میں پڑھ نہیں پاتا، کیونکہ یا تو اپنے پیروں کو گرم رکھنے کے لیے مجھے ادھر سے اُدھر

چلتے رہنا پڑتا ہے یا پھر جاڑے کا پہلا پالا پڑتے ہی مجھے بستر میں دبکا رہنا پڑتا ہے...

"میں نے پورا جاڑا اوورکوٹ کے بغیر گزار دیا۔ میرے پاس ایک ہی ہلکا سا کوٹ تھا جو کالیاری کے لیے مناسب تھا۔ ۱۹۱۲ء کے مارچ میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ مجھے بولے ہوئے کئی مہینے بیت گئے۔ مجھے جب بولنا ہی پڑتا تھا تو سارے الفاظ گڈمڈ ہو جاتے تھے"

اس وقت تورین یونیورسٹی میں بہترین ذہن جمع تھے۔ یونیورسٹی میں طلبا کے ذہن میں گھڑے گھڑائے نظریات ٹھونسنے کے بجائے تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور انھیں تحقیق کے طریقہ کار کی ہی تربیت دی جاتی تھی۔ گرامچی کا ذہن رسا اس تربیت کو جذب کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں گرامچی کا ذہن اس نظم و ضبط کا پابند ہوا، جو حق اور صداقت کی تلاش میں آگے چل کر اس کا معاون ثابت ہوا۔

اس زمانہ میں گرامچی اُن طلباء سے ہی ملتا جلتا تھا، جو اسی کی طرح سارڈینیا سے ہی وہاں آئے تھے۔ ان میں تولگلیاتی بھی شامل تھا۔ اینجیلو تاسکا سے بھی گرامچی کافی قریب تھا۔ تاسکا ایک محنت کش سوشلسٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور تولگلیاتی کے برعکس، وہ اس کم عمری میں ہی عملی سیاست میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

انھیں دنوں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ کر لیا۔ خود اٹلی کا جنوبی خطہ متعفن غربت و افلاس، جہالت و امراض کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا، لیکن اٹلی نے اس کے باوجود ایک غیر ترقی یافتہ ملک پر غاصبانہ قبضہ کر کے جھوٹی عظمت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اُس وقت بھی اٹلی میں ایسے افراد موجود تھے، جو اس غاصبانہ قبضہ اور اس طرح تہذیب افریقہ برآمد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ اس فضا میں تولگلیاتی اور گرامچی ایک دوسرے کے قریب آئے اور اُن کے درمیان باقاعدگی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس وقت گرامچی محض سارڈینیائی قوم پرست تھا ——— کافی کٹر قوم پرست جس کا خیال تھا کہ باقی اٹلی کے لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی وجہ سے ہی سارڈینیا معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ لیکن سارڈینیائی قوم پرستی کے اس جذبہ میں سوشلسٹ رجحانات کی بھی آمیزش تھی۔ اُس وقت اٹلی کے سوشلسٹ بھی سارڈینیا کی پسماندگی کے اسباب اس جزیرہ کے عوام کی خصوصیت میں ہی تلاش کرتے تھے۔ گرامچی کے جذبات کو اس رویہ سے ٹھیس لگتی تھی، اس لیے گرامچی تورین کے سوشلسٹوں سے ذرا دُور ہی رہتا تھا۔

لیکن گرامچی کا ذہنی جھکاؤ کچھ ایسا تھا کہ سوشلسٹ اس سے یکسر مایوس نہیں ہوئے تھے۔ تاسکا نے "جنگ اور امن" کے فرانسیسی ایڈیشن کی ایک جلد گرامچی کو بھینٹ کرتے ہوئے اس کا انتساب ان الفاظ میں لکھا تھا: "آج کے میرے دوست کے لیے، جو مجھے اُمید ہے کل کی جدوجہد میں میرا ساتھی ہوگا" اس انتساب پر ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کی تاریخ درج ہے۔

یونیورسٹی کے پہلے امتحان میں گرامچی نے جغرافیہ میں ۳۰ میں ۳۰، یونانی اور لاطینی گرامر میں ۳۰ میں سے ۲۷ اور لسانیات میں ۳۰ میں سے ۳۰ نمبر حاصل کیے۔ اس دوران، گرامچی، لسانیات کے استاد، پروفیسر بارتولی کے بہت قریب آگیا تھا اور سارڈینیا کی بولی پر وہ دونوں مل کر کام کر رہے تھے۔ گرامچی پروفیسر امبرتو کوسمو کے بھی کافی قریب تھا، جو اطالوی ادب کا

استاد تھا۔ دونوں کے درمیان ادب پر دھواں دھار بحثیں بھی ہوتی تھیں۔

مارچ ۱۹۱۳ء میں گرامچی کی عمر بائیس سال تھی اور وہ یونیورسٹی کے ادبیات کے شعبہ میں دوسرے سال میں داخل ہو چکا تھا۔ لیبیا پر قبضہ کی قیمت اٹلی کے محنت کش طبقہ سے وصول کی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے مزدوروں میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹ مارچ کو تورین کے کار بنانے والے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ مالکوں کی دھمکیوں اور انتقامی کارروائیوں کے باوجود، یہ ہڑتال ۹۶ دن تک جاری رہی۔ اس دوران ہڑتالی مزدوروں کی روزانہ ایک پارک میں میٹنگ ہوتی تھی، جہاں مزدور آپس میں صلاح و مشورہ کرتے تھے۔ جب تک یہ ہڑتال جاری رہی، شہر والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ گرامچی مزدوروں کی اس جدوجہد سے متاثر ہوا اور تولیاتی بھی۔ وہ جب بھی ملتے، اس ہڑتال کے بارے میں باتیں کرتے۔ دونوں کلاس روم سے نکل کر پارک کی طرف جاتے ہوئے ہڑتالی مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتے اور ان سے باتیں کر کے ان کی جدوجہد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر گرامچی اکتسابِ علم میں مصروف تھا۔ اپنے مضامین سے ذرا سی بھی فرصت ملنے پر گرامچی یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں میں لیکچر سننے چلا جاتا تھا۔ جسمانی اور اعصابی کمزوری بھی گرامچی کے ذہنی تجسس کو سرد اور کمزور نہ کر سکی۔

جولائی میں صحت کی خرابی کی وجہ سے گرامچی یونیورسٹی سے چھٹی لے کر گلزا واپس آگیا۔ چناؤ کے ضابطوں قاعدوں میں اصلاحات کے بعد نئے چناؤ ہونے والے تھے۔ اس وقت سار دینیا میں آزادانہ تجارت کے حق میں زبردست مہم اخباروں میں چھڑی ہوئی تھی۔ حکومت نے اٹلی کے صنعت کاروں کے مفادات مدِنظر رکھتے ہوئے فرانس سے درآمدات بند کر دی تھیں جس کے جواب میں فرانس نے اٹلی سے زراعتی پیداوار کی درآمد بند کر دی تھی۔ اس پابندی کا براہ راست اثر جنوبی اٹلی بشمول سار دینیا کے زراعت پیشہ خطے کی معیشت پر پڑا تھا۔ آزادانہ تجارت کے حق میں ایک مینی فیسٹو تیار کیا گیا تھا جس پر مختلف سوشلسٹ لیڈروں اور دانشوروں کے دستخط تھے۔ گرامچی نے بھی اس مینی فسٹو پر دستخط کیے اور اس طرح گرامچی کا نام پہلی بار کسی سیاسی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہوا۔

۲۶ اکتوبر کو سار دینیا میں ووٹنگ ہوئی تھی، جس میں ۱۲ نمائندے چنے جانے تھے۔ پہلی بار ان پڑھ کسانوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا تھا۔ سوشلسٹوں کو توقع تھی کہ یہ چناؤ ایک سیاسی زلزلہ ثابت ہوں گے۔ گرامچی لکھتا ہے: ”یہ مجذوبانہ یقین عام تھا کہ چناؤ کے بعد ہر چیز حیرت انگیز طور پر بدل جائے گی اور سماجی لحاظ سے زیر و زبر ہو جائے گا۔ کم سے کم سار دینیا میں ایسا ہی یقین کیا جا رہا تھا۔“

لیکن واقعی صورتِ حال یہ تھی کہ پچھلے دو سالوں سے سوشلسٹ تحریک کمزور پڑ رہی تھی۔ کالیاری جیسے بڑے شہر میں سوشلسٹ پارٹی کی شاخ اور چیمبر آف لیبر نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ان پڑھ عوام میں نئے خیالات کا پرچار کرنے والے گنتی کے تھے۔ ان گنتی کے پرچارکوں کو بھی بعد میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ سو میں سے نوے مزدور ہماری بات کو سنتے تو ہیں لیکن یہ نئے خیالات ان کے پلے نہیں پڑتے۔ پھر اس زمانے کے سوشلسٹ اپنے پرچار میں چرچ اور پادری شاہی کی اندھی مخالفت کو ہی اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے۔ سوشلسٹوں کے چرچ دشمن پرچار سے مخالفین نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان پڑھ ووٹروں کے ذہنوں میں بسے ہوئے صدیوں پرانے بتوں کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ پھر بھی اس چناؤ نے حالات کو ایک نیا روپ دیا۔ اس سے پہلے چناؤ محدود حق رائے دہندگی کی بنیاد پر نظریات کے بجائے ذاتیات کی بنیاد پر ہی لڑے

جاتے تھے۔ اس چناؤ میں پہلی بار نظریات کی بنیاد پر صف بندی ہوئی۔ سار دینیا کا صاحبِ زر و زمین طبقہ جو اس سے پہلے مرکزی حکومت کے خلاف مزدوروں کے مطالبات تک کی حمایت کرتا تھا، اچانک روم کی حکومت کا ہمنوا بن گیا اور غیر منظم محنت کش طبقہ کے غیر منتظم حملے کے خلاف ان کا ایک متحدہ محاذ وجود میں آگیا۔

لیکن سوشلسٹ دشمن طاقتوں کے متحدہ محاذ کے خلاف بین سوشلسٹ ممبر پھر بھی چناؤ میں کامیاب ہوئے۔ گرامچی کا ذہن بھی اس تجربے سے متاثر ہوا۔ انجیلو تاسکا کے یقین کے مطابق، اس تجربے نے گرامچی کے ذہن کو سوشلسٹ قالب میں ڈھال دیا۔ چناؤ سے قبل گرامچی سار دینیا کی علاقائی خود مختاری کا حامی تھا اور وہ باقی اٹلی کو سار دینیا کے تمام معاشی مسائل کا سبب سمجھتا تھا۔ لیکن چناؤ کے تجربات نے گرامچی کو اپنے ان نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جنوبی اٹلی کے کسانوں، چھوٹے زمینداروں اور نچلے متوسط طبقے کا استحصال کرنے والے شمال کے مزدور اور صنعت کار نہیں، بلکہ صنعت کاروں اور جنوبی اٹلی کے حکمراں طبقہ کا گٹھ جوڑ ہے۔ دشمن گھر کے دروازے پر بھی موجود تھا۔ تورین کا وہ مزدور سار دینیا کے مفلوک الحال طبقہ کا دشمن نہیں تھا، جسے گرامچی ۹۶ دن تک ہڑتال کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس تجربہ اور احساس کے ساتھ گرامچی سوشلسٹ تحریک کے بہت قریب آگیا۔

اس مرحلہ پر سار دینیائی قوم پرستی کا حامی و علمبردار گرامچی ہمہ گیر گرامچی میں تبدیل ہونے لگا، جو قصباتی ذہنیت کو ترک کر کے وسیع تر ادراک کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا، لیکن گرامچی نے محض قصباتی ذہنیت کو ہی ترک کیا تھا۔ اس زندگی کے تجربات کو فراموش نہیں کیا تھا، جس نے اس کے ذہن پر واضح نقوش چھوڑے تھے۔ گرامچی سوشلسٹ پارٹی کی پالیسیوں میں پسماندہ جنوب کے مسئلہ کو اہم مقام دیے جانے کا حامی تھا۔ اسی مرحلہ پر گرامچی طلباء کے محدود حلقے سے نکل کر ایک وسیع تر حلقے میں شامل ہو گیا، جس میں دفتروں میں کام کرنے والے کلرک بھی تھے اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور بھی۔ ان کے ساتھ گرامچی مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتا اور وہ گرد و پیش میں تبدیلیاں لانے اور ان تبدیلیوں کے موضوع پر گفتگو کرتے، جو گرد و پیش میں تیزی کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔

اس وقت یورپ پر پہلی جنگِ عظیم کے بادل چھا رہے تھے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو جنگ شروع ہونے سے چار دن قبل اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی نے مطالبہ کیا کہ اس جنگ میں اٹلی کو مکمل طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ لیکن اس غیر جانبداری کے مفہوم کے بارے میں سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ میں اختلاف رائے تھا۔ اس وقت مسولینی سوشلسٹ پارٹی کے اخبار "اوانتی" کا ایڈیٹر تھا۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد ۱۸ اکتوبر کو اس اخبار میں مسولینی کا ایک مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا: "مکمل غیر جانب داری سے متحرک اور معنی خیز غیر جانب داری تک۔" اس مضمون کے بارے میں مختلف ردِ عمل سامنے آئے۔ گرامچی نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور بحث کے سلسلے میں گرامچی کا پہلا سیاسی مضمون ۳۱ اکتوبر کو تورین کے سوشلسٹ اخبار "الگریدو دیل پوپولو" (جنتا کی آواز) میں شایع ہوا۔ اشاعت سے پہلے گرامچی نے اپنا مضمون تو گلیاتی کو دکھایا تھا اور تو گلیاتی نے گرامچی کے دلائل سے اتفاق رائے ظاہر کیا تھا۔

مسولینی کا مضمون غیر واضح تھا۔ گرامچی اور مسولینی کے مضامین میں الفاظ کی مماثلت کے باوجود، جنگ کے بارے میں دونوں کا رویہ ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوا۔ گرامچی نے اصلاح پسندوں کو اپنے مضمون میں نشانہ بنایا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ وہ جنگ کے جوئے میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسرے

اس جوئے میں بازی لگائیں اور جیت جائیں تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ پرولتاریہ واقعات کا غیر جانبدار تماشائی بنا رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ وہ واقعات بالآخر اس کے لیے ثمر آور ثابت ہوں گے، جبکہ اس دوران مدِ مقابل واقعات کے رخ کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور طبقاتی جد و جہد کے لیے فعّال طریقے سے میدان تیار کر رہا ہے۔"

گرامچی نے اپنے مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انقلابیوں کو ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں، جو فیصلہ کن سماجی انتشار، (دوسرے لفظوں میں، انقلاب) میں ان کے ممد و معاون ہوں اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے انقلاب پسندوں کو سماج کی فعال اور غیر فعال طاقتوں پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہنا چاہیے۔ بعد میں، اس مضمون کی بنیاد پر انتہا پسندوں نے گرامچی پر جنگ کی حمایت کرنے کا الزام عائد کیا تھا، جو قطعی بے بنیاد تھا، کیونکہ گرامچی نے اپنے مضمون میں جنگ میں مداخلت کی حمایت نہیں کی تھی، بلکہ اس نے جنگ کے پیدا کردہ حالات کا تختۂ مشق بننے کے بجائے اُن حالات کو موافق بنانے اور ان کو پرولتاریہ کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

اس مرحلہ پر گرامچی کی جسمانی و اعصابی کمزوری پھر عود کر آئی۔ اس مرحلہ پر گرامچی یونیورسٹی میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لے رہا تھا۔ گرامچی نے کسی نہ کسی طرح پڑھائی کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ ١٣ اپریل ١٩١٥ء کو وہ اطالوی ادب کے امتحان میں بیٹھا۔ اور گرامچی کے لیے یہ امتحان یونیورسٹی کا آخری امتحان ثابت ہوا۔ اور اس مرحلہ پر اس کی یونیورسٹی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

لیکن تعلیمی سلسلہ کا ختم ہونا گرامچی کے لیے سُود مند ہی ثابت ہوا، کیونکہ اس سلسلہ کے ختم ہونے کے ساتھ گرامچی تنہائی کے اس خول سے باہر نکل آیا، جس میں وہ اب تک قید تھا۔ گرامچی تورین میں ہی تھا کہ اٹلی کے جنگ میں شامل ہونے سے ایک ہفتہ قبل ١٧ مئی کو تورین کے مزدور طبقہ نے اٹلی کی جنگ میں شمولیت کے خلاف عام ہڑتال کر دی، جس کے دوران مسلح پولیس اور مزدوروں کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں۔ "الگریدو ویل پوپولو" میں گرامچی کے پہلے مضمون کی اشاعت کے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ بیتنے کے بعد اس کا دوسرا مضمون ١٣ نومبر ١٩١٥ء کو اسی اخبار میں شائع ہوا۔ یہ مضمون یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں کی اس میٹنگ کے بارے میں تھا، جو دو مہینے قبل سوئٹزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر زمروالڈ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میٹنگ میں سوشلسٹ پارٹیوں نے سامراجی طاقتوں کی جنگ میں شمولیت کی مخالفت کی تھی۔ اس میٹنگ میں یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں کے جن رہنماؤں نے شرکت کی تھی، اُن میں لینن کا نام پہلی بار اٹلی کے محنت کش طبقہ کے سامنے آیا تھا۔ اسپین کی سوشلسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس کا تذکرہ کرتے ہوئے گرامچی نے اپنے اس مضمون میں لکھا تھا:

"چھوٹی چھوٹی تحریکیں ہماری نظر میں عظیم تحریکیں نظر آتی ہیں، کیونکہ ہم اِن تحریکوں کا رشتہ اُن تحریکوں سے جوڑتے ہیں، جنھیں صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم ان تحریکوں کو جی رہے ہیں، وہ تحریکیں خود ہم ہیں... ہم وہ ذرات ہیں، جو ابھی بطنِ حمل میں ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ بے شمار قطرے ایک عظیم لہر بنیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس احساس ذہنی میں انٹرنیشنل حقیقتاً زندہ و متحرک ہے۔"

گرامچی اپنی پچھلی تنہائی اور علیحدگی پسند زندگی کو پیچھے چھوڑ کر زندگی کے میدانِ عمل میں کود گیا اور عملی سیاست میں

حصّہ لینے کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں اس کے وہ جوہر کھلنے لگے، جو تنہائی اور علیحدگی کی زندگی میں نشوونما پا رہے تھے۔ اسی مرحلہ پر گرامچی نے اپنے گھر والوں سے بھی دوبارہ رابطہ قائم کیا، جو تنہائی اور علیحدگی کے دور میں ایک دم منقطع نہیں تو کمزور ضرور پڑ گیا تھا۔ اس عملی دور کی شروعات کے ساتھ ہی ایک نئے گرامچی کا جنم ہوا، جس کے ادراک و احساس میں سوشلزم کا فلسفہ پوری طرح جذب ہو چکا تھا اور جو اب ایک پیشہ ور انقلابی تھا۔ اس وقت گرامچی کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

۱۹۱۶ء کے بعد سے گرامچی کا زیادہ تر وقت "کاساویل پوپولو" (جنتا بھون) میں بیتنے لگا، جہاں تورین کے مزدوروں کی مختلف تنظیمیں اور امداد باہمی کی انجمنوں کے دفاتر تھے۔ اسی جنتا بھون کی آخری منزل پر تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ میں "الگریدو دیل پوپولو" کا دفتر تھا، جبکہ دوسرے کمرے میں "اوانتی" کے تورین ایڈیشن کا دفتر تھا اور تیسرے کمرے میں سوشلسٹ پارٹی کی علاقائی شاخ کا مرکزی دفتر تھا۔ "الگریدو" کی ادارت جوزف بیانچی کے سپرد تھی۔ ۱۹۱۶ء کے اواخر میں بیانچی کو جبری بھرتی کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس کے بعد "الگریدو" کی ادارت کی ذمہ داری پرائمری اسکول ٹیچر ماریا جیودلیس نے سنبھالی، جو آٹھ بچوں کی ماں تھی۔ "اوانتی" کی ادارتی ذمہ داریاں پاستورے، گرامچی اور ایک سابق ویٹر لیو گیلیتو کے سپرد تھیں، جو ایک دلچسپ کردار تھا اور نہایت بھڑک دار لباس پہنتا تھا۔

ان دونوں اخبارات کے صفحات پر گرامچی ایک ایسے صحافی کے روپ میں ابھرا، جو کانفرنسوں سے لے کر معمولی جرائم تک، اور ڈراموں پر تبصروں سے لے کر کتابوں پر تنقید و تبصروں تک میں اپنے ایک انفرادی رنگ کا مالک تھا اور اور اس انفرادی رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان تبصروں میں سوشلسٹ انداز فکر و نظر ایک مشترکہ کڑی کے روپ میں موجود ہوتا تھا۔ گرامچی کے اس اسلوب تحریر کو طنز کے عنصر نے مزید دھاردار بنا دیا تھا، لیکن گرامچی نمود و نمائش سے اس قدر دور اور خیالات و افکار کی دنیا کے اتنے قریب تھا کہ اس کے اکثر تبصرے اس کے نام کے بغیر ہی شایع ہوتے تھے۔ اس کے مضامین کے اخیر میں اکثر صرف اس کے نام کے ابتدائی حروف "اے۔ جی" شایع ہوتے تھے یا "الفا گاما" کا قلمی نام شایع ہوتا تھا۔ بہت کم پڑھنے والوں کو لکھنے والے کا اصل نام کا علم تھا، لیکن ان مضامین کے ساتھ گرامچی کا نام شایع نہ ہونے کے باوجود، سب پڑھنے والے اس کے انفرادی رنگ سے کماحقہ واقف ہو چکے تھے۔

گرامچی اپنے مضامین میں مارکسی نظریہ اور اصول کی روشنی میں حقائق کو دیکھتا تھا اور وہ اس نظریہ و اصول سے گریز اس عمل کو بے اثر و بے ثمر سمجھتا تھا۔ ان مضامین میں گرامچی کا یہ نظریہ بھی کارفرما نظر آتا تھا کہ عوام کے ذہنوں کی تہذیب و تربیت جلسوں کے پلیٹ فارم پر سے نہیں، بلکہ سوال و جواب کے سلسلے وار ڈھنگ سے ہی ممکن ہے۔ گرامچی ۱۹۱۶ء میں ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ انقلابی سرگرمی اور عوام کی ذہنی تہذیب و تربیت میں گہرا رابطہ قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہی گرامچی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

"اِنسان اوّلین سطح پر ذہن یا آتما کا ہی دوسرا نام ہے، یعنی وہ تاریخ کا حاصل ہے، نیچر کا نہیں۔ اس بات کو تسلیم کیے بغیر، اس کی توضیح پیش کرنا ممکن نہیں کہ سوشلزم اس سے پہلے وجود میں کیوں نہیں آ گیا جبکہ استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے، دولت پیدا کرنے والے اور دولت کا خودغرضانہ صَرف کرنے والے طبقے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ اِنسان کو اپنی قدر و قیمت کا

احساس آہستہ آہستہ قدم بہ قدم ہی ہوا ہے ——— سماج کے مختلف حلقوں میں یکے بعد دیگرے اپنی قدر و قیمت کا یہ احساس بیدار ہوا ہے . . . یہ احساس فوری حیوانی ضروریات کا پیدا کردہ نہیں تھا، بلکہ فہم و منطق کا نتیجہ تھا۔ پہلے چند لوگوں میں ہی فہم و ادراک بیدار ہوا اور بعد میں یہ فہم و ادراک ——— پورے طبقوں کا احساس بن گیا، جو سماجی حقائق کے اصل اسباب کا ادراک کرنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ استبدادی ڈھانچے کو بغاوت اور تعمیر نو کے ڈھانچے میں تبدیل کرنے کے ذرائع موجود ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک انقلاب سے قبل بڑے پیمانے پر سماجی عوامل پر تنقید، ذہنوں کی نئی تہذیب و تربیت اور انجذاب ضروری ہے۔"

"الگریدو" اور "اوانتی" کے معاون مدیر کی حیثیت سے گرامچی نے جو کچھ لکھا، وہ پرولتاریہ میں یہی احساس بیدار کرنے کے نقطۂ نظر سے لکھا۔ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے گرامچی پرولتاریہ کے ذہن اور اس کی تہذیب و تربیت کو ہی سامنے رکھتا تھا، جبکہ گرامچی کے موضوعات مختلف النوع تھے۔ پیراندیلو کے ڈراموں پر توضیحی و تعریفی انداز میں سب سے پہلے گرامچی نے ہی اتنا کچھ لکھا تھا کہ ان سے دو سو صفحات کی کتاب ترتیب دی جا سکتی تھی۔ اپنے روزانہ کالم میں بھی گرامچی جو کچھ لکھتا تھا، وہ اتنا وزنی، اہم اور معنی خیز ہوتا تھا کہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت و افادیت تازہ رہتی تھی۔ چنانچہ، گرامچی کے روزانہ کالم کا ایک انتخاب "اوانتی" کے قارئین کے لیے کتابی صورت میں شایع ہوا تھا۔

گرامچی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہی محنت کش طبقہ کے ذہن کو انقلابی نظریات سے روشناس کرانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ تورین کے ان محلوں اور آبادیوں میں بھی جا کر مزدوروں کے سامنے ان موضوعات پر تقاریر اور تبادلۂ خیال کرتا تھا، تاکہ اُن کے ذہنوں کی وہ نئی تہذیب و تربیت ہو سکے، جو اُن کے مادّی حالات سے مطابقت رکھتی تھی۔ ان مزدوروں کے سامنے گرامچی کسی نئے ناول یا نئے ڈرامے کے پس منظر میں بھی بولتا تھا اور فرانسیسی انقلاب جیسے تاریخی موضوعات کے ذریعہ بھی وہ اُن کے ذہنوں کی تہذیب و تربیت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

دوسری پارٹیوں سے سوشلسٹ پارٹی کے تعلقات کے بارے میں بھی گرامچی کی رائے سوشلسٹ لیڈروں کی عام رائے سے مختلف تھی۔ گرامچی کے بارے میں اپنے مضمون میں بارستا سانیتا نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرامچی کا رویّہ اس مسئلہ کے بارے میں کتنا وسیع، مدلّل اور مارکسی تھا۔ سانیتا لکھتا ہے:

"ایک بار میں "الگریدو" کے دفتر گیا تو میں نے گرامچی کو چار نوجوانوں سے محوِ گفتگو پایا۔ جب یہ طویل گفتگو ختم ہوئی اور مجھے پتہ چلا کہ یہ چاروں نوجوان کیتھولک تھے تو میں حیرت زدہ رہ گیا، کیونکہ اُن کی جنگ کی مخالفت کی وجہ ہماری جنگ کی مخالفت کی وجہ سے مختلف تھی۔ وہ اپنے صلحِ کُل کے نظریہ کی بنیاد پر جنگ کے مخالف تھے۔ (ہم ہر قسم کی جنگ کے خلاف ہیں، وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے) اُن کی

اس مخالفت کی بنیاد ہی انجیل مقدس تھی۔ گرامچی نے مشتعل کرنے کے خیال سے مجھ سے کہا کہ شاید میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ میں فوری طور پر گرامچی کی نیت کو نہیں بھانپ سکا اور میں نے سادہ لوحی سے پوچھا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں معجزاتی امن کے لیے ان نوجوانوں کی دعاؤں میں ان کے ساتھ دو زانو ہو جاؤں۔ گرامچی نے بڑے خشک لہجے میں کہا۔ "یہاں تمہیں محض اندھی پادری شاہی کی مخالفت ہی سکھائی جاتی ہے، جو دانش اور سیاست کے تقاضوں کے عین برعکس ہے۔ چرچ میں بھی نہیں جاتا، کیونکہ میں مذہب پرست نہیں ہوں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی اکثریت مذہب پرست ہے۔ اگر ہم الحاد پرستوں کے علاوہ سبھی کو نظر انداز کرتے رہے تو ہم ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ بورژوا ذہنیت رکھنے والے الحاد پرستوں کی بھی کمی نہیں ہے، جو پادریوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور کبھی چرچ میں قدم نہیں رکھتے، لیکن یہ الحاد پرست سوشلسٹ دشمن، جنگ میں شرکت کے حامی اور ہمارے کٹر دشمن ہیں۔ یہ لڑکے گرجا میں مناجات ضرور کرتے ہیں، مگر یہ صنعت کار نہیں ہیں۔ یہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ انہیں ہمارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے، تاکہ جنگ کو جلد سے جلد بند کرایا جا سکے۔"

اس طرح اپنے قلم اور زبان کے ذریعہ گرامچی سوشلزم کے نظریات کو اس تنگ حد بندی سے نکالنے کی انتھک جدوجہد کر رہا تھا، جو پرانے سوشلسٹ رہنماؤں نے ان نظریات کے گرد کھڑی کر دی تھی۔ اس جدوجہد میں ہی گرامچی کا تمام تر وقت صرف ہوتا تھا۔ اس مرحلہ پر اس کی نجی زندگی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ جن لوگوں سے وہ کبھی کبھار نجی سطح پر ملتا تھا، ان کی تعداد ایک ہاتھ کی آدھی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

۱۹۱۶ء کے اواخر میں گرامچی کے علم میں آیا کہ نوجوان سوشلسٹوں کی تنظیم ایک کتابچہ شایع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ گرامچی نے فوراً یہ کتابچہ لکھنے کی پیش کش کی۔ ۱۱ فروری ۱۹۱۷ء کو یہ کتابچہ شایع ہوا۔ کتابچہ کا عنوان تھا: "شہر مستقبل"
یہ کتابچہ اپنی چند نظریاتی خامیوں کے باوجود، جس کا اقرار بعد میں خود گرامچی نے کیا تھا، گرامچی کی اس وقت تک کی ذہنی نشو و نما کا مظہر ہے۔ اس کتابچہ کے پہلے مضمون کا عنوان ہے: "تین اصول تین نظام"

"نظم اور بدنظمی ایسی اصطلاحات ہیں، جو سیاسی مباحثوں میں بکثرت استعمال کی جاتی ہیں۔ نظم پیدا کرنے والی پارٹی، نظم کو کرنے والے لوگ اور عوام میں نظم و ضبط . . . لفظ "نظم" میں معجزاتی قوت پوشیدہ سمجھی جاتی ہے اور سیاسی ادارے اکثر اسی قوت کے بل بوتے پر زندہ رہتے ہیں موجودہ سماجی نظام کو ایک ایسے مستحکم نظام کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے، جس کی

بنیادی ہم متناسب ہم آہنگی پیدا رکھی گئی ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کا دل کسی بنیادی تبدیلی کے خیال سے ہی بیٹھنے لگتا ہے کہ نہ جانے یہ بنیادی تبدیلی کیسی تبدیلی ثابت ہو۔ ۔ ۔ یہ لوگ محض حال کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا تو تصور کر سکتے ہیں، لیکن اس نظام کا تصور نہیں کر سکتے، جو ممکن ہے اور جو پچھلے نظام سے بہتر نظام ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ یہ لوگ محض پرتشدد تخریب کا ہی تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے کھونے کے خیال سے ہی کانپ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ۔ ۔"

مضمون کے اخیر میں گرامچی لکھتا ہے:

"سوشلسٹوں کا کام ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام تھوپ دیں۔ ان کا کام ایک نئے نظام کی تخلیق کرنا ہے، جو حقیقی نظام ہے۔ انہیں اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انسان کی پوری شخصیت کی ہمہ جہت تکمیل ممکن ہے اور اس تکمیل پر ہر شہری کا مساوی حق ہے۔ اگر اس اصول کو عملی شکل دے دی جائے تو ماضی کے امتیازات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح انسان کم از کم پابندیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آزادی سے بہرہ مند ہو سکے گا۔ یہ نظام انفرادی اہلیت اور پیدائشی صلاحیت کو زندگی اور محاسبات کے قانون کا درجہ دے دے گا اور باقی سارے روایتی ڈھانچے فرسودہ ہو جائیں گے۔ ایسے نظام میں دولت غلامانہ نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ نہیں رہے گی، بلکہ دولت غیر شخصی سطح پر سب کی ملکیت ہوگی اور ہر ایک کو حتی المقدور اس سے فلاح پانے کا حق ہوگا۔ کسی تفریق کے بغیر اسکول فہم و دانش کی نشوونما کریں گے۔ ۔ ۔ اس اصول پر ہی باقی تمام سوشلسٹ اصولوں کی اساس رکھی جانی چاہیے۔ یہ ماورائے حقیقت تصور نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھوس اصول ہے، جسے ارادی قوت سے ٹھوس عملی شکل دی جا سکتی ہے، یہی اصول حقیقی، سوشلسٹ نظام کا بنیادی اصول ہے۔ ۔ ۔"

انسان زندگی بھر اچھے، برے اور نیک و بد کے درمیان شعوری یا غیر شعوری سطح پر کسی ایک کا انتخاب کرتا رہتا ہے۔ اس بارے میں گرامچی لکھتا ہے:

"فریڈرک ہسل کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جینے کا مطلب اس طرف

یا اُس طرف کا انتخاب کرنا ہے... میں بے حسی لوگوں سے نفرت کرتا ہوں... بے حسی تاریخ میں ایک زبردست قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ غیر فعال، لیکن مؤثر طریقے سے کام کرتی ہے... واقعات سایوں میں پروان چڑھتے ہیں... چند ہاتھ، جو کسی کے بھی سامنے جواب دہ نہیں ہوتے، اجتماعی زندگی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ عوام الناس کو ان واقعات کی اصلیت کا کبھی علم نہیں ہو پاتا، کیونکہ وہ اس کے بارے میں جاننا ہی نہیں چاہتے... میں جانب دار ہوں، میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے حزب کے توانا وجود کو اپنے دل کی دھڑکن میں محسوس کرتا ہوں... اس شہرِ مستقبل کی زندگی کے وجود کو جس کی تعمیر میرے حزب نے شروع کر دی ہے... میں زندہ ہوں اور میں اپنے حزب کا انتخاب کرتا ہوں۔ چنانچہ میں ہر اُس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو اپنے حزب کا انتخاب نہیں کرتا... میں بے حسی سے نفرت کرتا ہوں...“

گرامچی نے اس ضمن میں اپنے اس یقین کا بھی اظہار کیا تھا کہ انسان کی مضبوط قوتِ ارادی تاریخ [illegible] تقا[illegible]یں اہم ترین مقام رکھتی ہے، کیونکہ واقعات خود بخود وقوع پذیر نہیں ہوتے، بلکہ وہ انسان کی قوتِ ارادی اور ع[illegible]ن نتیجہ ہوتے ہیں۔

یہ کتابچہ فروری ۱۹۱۷ء میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت روس میں انقلاب کی شروعات ہو چکی تھی ——— لیکن انقلاب کے بارے میں اٹلی میں جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں، وہ غیر واضح اور الجھن میں ڈالنے والی تھیں۔ بورژوا اخبارات اور خبر رساں ایجنسیاں بھی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی تھیں۔ ۱۸؍مارچ کو یہ خبر آئی کہ زار کا تختہ پلٹ دیا گیا ہے اور روس میں ایک عبوری حکومت قائم ہو گئی ہے، جو جنگ جاری رکھنا چاہتی ہے، لیکن لینن کی رہنمائی میں بائیں بازو کے انتہا پسند انقلابی ہر قیمت پر جنگ بندی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

۲۹؍اپریل ۱۹۱۷ء کے ”اِل گریدو“ میں روسی انقلاب کے بارے میں گرامچی کا پہلا تبصرہ شایع ہوا:

”بورژوا اخبارات نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ وہاں شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی طاقت نے لے لی ہے۔ بورژوا اخبارات یہ امید کر رہے ہیں کہ یہ طاقت، بورژوا طاقت ہوگی۔ انھوں نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے: روسی انقلاب فرانسیسی انقلاب۔ وہ ان دو واقعات کو ایک دوسرے کے مماثل ظاہر کر رہے ہیں... بہرکیف، ہمارا یقین ہے کہ روسی انقلاب کی نوعیت پرولتاری ہے اور اس کی یہ نوعیت اس کے اب تک کے اقدامات سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ پرولتاری انقلاب سوشلسٹ حکومت پر ہی منتج ہوگا۔“

لینن کے اس اعلان کے بعد کہ "مزدوروں اور کسانوں کی کونسلوں کے ذریعہ سارا اقتدار پرولتاریہ کو سونپ دیا جائے" لینن پر بورژوا اخبارات میں حملے کیے جانے لگے، جبکہ اٹلی کے محنت کش طبقہ کی نگاہ میں لینن ایک ایسے رہبر کے روپ میں ابھرا، "جو سب سے زیادہ سوشلسٹ" اور "الگریدو" کے الفاظ میں "روس کی سوشلسٹ پارٹیوں کے سربرآوردہ رہنماؤں میں سب سے زیادہ انقلابی رہنما تھا۔"

۱۳ اگست، ۱۹۱۷ء کو انقلابی حکومت کے دو نمائندے، گولڈن برگ اور سمرنوف تورین پہنچے تو چالیس ہزار مزدوروں کے جمِّ غفیر نے اُن کا استقبال کیا۔ یہ دونوں نمائندے اتحادی حکومتوں سے ابتدائی رابطہ قائم کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ چند دن قبل ہی گولڈن برگ نے پیرس میں بیان دیا تھا، "لینن ہمارا حلیف نہیں ہے۔ ہم اُس کے حریف ہیں۔" مگر کرنیسکی سرکار کے یہ دو نمائندے جب تورین میں جنتا بھون کی بالکنی میں مزدوروں کے سامنے آئے تو مزدوروں نے "لینن زندہ باد!" کے نعروں سے اُن کا استقبال کیا! کرنیسکی سرکار کے نمائندوں کی آمد سے چند دن پہلے "الگریدو" نے روس کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "کرنیسکی اور اس کے ساتھیوں نے فی الحال طاقتوں کے موجودہ توازن کے بل بوتے پر عنانِ اقتدار سنبھالی ہے۔ کرنیسکی اور اس کے ساتھی رُوسی انقلاب کا محض آج ہیں، لیکن لینن اور اس کے ساتھی انقلابی روسی انقلاب کا آنے والا کل ہیں۔"

دس دن بعد تورین کی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں اور ٹریفک بند ہوگیا۔ اس ابال کا فوری سبب یہ تھا کہ دکانوں سے اچانک روٹی عنقا ہوگئی تھی، لیکن اس کا بنیادی سبب یہ احساس تھا کہ جرمنوں کے خلاف، بورژوا طبقہ کے مفادات کے لیے، دس ہزار جانیں گنوانے سے بہتر ہے کہ خود مزدوروں کے کاز میں پانچ سو جانیں قربان کردی جائیں۔ مزدوروں نے درخت اکھاڑ کر اور ٹرامیں اور ریل کے ڈبوں کو گھسیٹ کر راہیں مسدود کردیں، لیکن مزدوروں کی یہ بغاوت غیر منظم تھی اور باغیوں اور سوشلسٹ لیڈرشپ میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ مزدوروں کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ مسلح فوجی ان کے ہمدردی ظاہر کریں گے۔ فوج نے ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے جگہ بہ جگہ مزدوروں پر گولیاں چلائیں، جس میں پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے اور دو سو سے زیادہ زخمی۔

غیر منظم بغاوت کے فرو ہونے کے بعد سوشلسٹ لیڈروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ فوج نے جنتا بھون پر قبضہ کرلیا۔ شہر میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ اس ہنگامی مرحلہ پر تورین کے محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی ترتیب دی گئی، جس کے بارہ اراکین میں گرامچی کا نام بھی شامل تھا۔ اس دوران فلورنیس میں سوشلسٹ پارٹی کی ایک خفیہ کانفرنس ہوئی جس میں جنگ کی مخالفت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گرامچی کی رائے یہ تھی کہ جنگ کے پیدا کردہ بحران میں، انقلابی محنت کش طبقہ اب بھی موثر طریقے سے اثر انداز ہوسکتا ہے۔

اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کی یہ خفیہ کانفرنس ۱۸ نومبر کو ہوئی تھی، جبکہ چار دن قبل، ۱۴ نومبر کو روس میں لینن کی رہنمائی میں بالشویک برسرِ اقتدار آچکے تھے۔ ۱۰ نومبر کو اٹلی کے ایک بورژوا اخبار "گزیتا ول پوپولو" نے یہ خبر شائع کی تھی: "انتہا پسندوں کی ایک بھیڑ نے محل سرما کے شراب کے تہہ خانوں کو لوٹ لیا اور یہ بھیڑ شراب پی کر بدمست ہوگئی۔ بعد میں اس بھیڑ کو بہ زور طاقت منتشر کردیا گیا۔" اس بورژوا اخبار نے روس کے تاریخ ساز انقلاب کو شراب نوشوں کی ہڑدنگ کا درجہ دینے پر قناعت کی تھی۔ سنسرشپ کی پابندیوں کے باوجود، روس سے ملنے والی اطلاعات کا تجزیہ کرنے کے بعد ۲۴ نومبر کو گرامچی نے "الگریدو" میں یہ نتیجہ اخذ کیا: "الگریدو کی یہ پیش بینی صحیح ثابت ہورہی ہے کہ روسی انقلاب کرنیسکی دور پر ختم

نہیں ہوگا۔ روسی انقلاب جاری ہے اور جاری رہے گا" ۲۴ نومبر کو ہی روزنامے "اوانتی" میں گرامچی کے نام کے ساتھ ایک اداریہ شایع ہوا۔ اس اداریہ کا عنوان تھا: "کیپیٹل کے خلاف انقلاب"۔ صداقت کے متلاشی وجویا گرامچی نے اس اداریہ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صداقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"بالشویک انقلاب مارکس کے کیپیٹل کے خلاف انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ روس میں پرولتاریہ سے زیادہ بورژوا طبقہ کیپیٹل سے متاثر تھا۔ کیپیٹل میں انتقادی نقطۂ نظر سے یہ دکھایا گیا ہے کہ روس میں جبری احتیاج کے طور پر، بورژوا طبقے کا قیام عمل میں آئے گا اور وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی داغ بیل ڈالی جائے گی، مغربی طرز کی جمہوریت وہاں فروغ پائے گی اور اس کے بعد بھی پرولتاریہ اپنی نجات، اپنے طبقاتی مفادات، اپنے انقلاب کے بارے میں فکر کر سکے گا۔ لیکن واقعات نے اس ڈھانچے کو تار تار کر دیا ہے، جس کے چوکھٹے میں، تاریخی مادیت پرستی کے مطابق، روس میں واقعات ظہور پذیر ہونے چاہیے تھے۔ بالشویکوں نے اس طرح مارکس کی تردید کی ہے اور انھوں نے اپنے افعال، اپنی کامرانیوں سے اس حقیقت کی تصدیق کر دی ہے کہ تاریخی مادیت پرستی کے قوانین اس سے زیادہ لچکدار ہیں، جتنا کہ اب تک انھیں سمجھا جاتا رہا ہے۔ . . اگر بالشویکوں نے کیپیٹل کی چند پیش گوئیوں کی تردید کی ہے تو اسی کے ساتھ ہی انھوں نے اس کے ان عناصر سے انحراف نہیں کیا ہے، جو اس میں زندہ اور مستقل عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں . . ."

اس مضمون میں بھی گرامچی نے اپنے اس نظریہ کا اعادہ کیا ہے کہ تاریخ کا ارتقاء مکمل طور پر (اثبات پرستی کے مفہوم میں) معاشی قوتوں کا پابند نہیں ہے، بلکہ تاریخی ارتقاء میں انسان کی قوتِ ارادی بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ گرامچی کی صداقت پسندی اور حقیقت پسندی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ روس میں زارشاہی کا خاتمہ ہوتے ہی خوشحالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ گرامچی کی رائے تھی کہ انقلاب کے بعد کافی عرصے تک روس میں اجتماعی سطح پر، لوگوں کے حصہ میں مصائب اور تکالیف ہی آئیں گی، لیکن اس وقت کے حالات میں روس میں سرمایہ دارانہ نظام بدتر مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔

تورین میں اب بھی مارشل لا نافذ تھا، مقامی پارٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے گرامچی کے لیے کام کرنے کی راہیں مسدود تھیں۔ مگر وہ صحافت کے میدان میں سرگرم عمل تھا۔ "الگریدو" کی ایڈیٹر ماریا جیودلیس کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب گرامچی تنہا "الگریدو" کی ادارت کا ذمہ دار تھا۔ جلد ہی نئے مدیر کے زیر نگرانی رسالے کی نئی شخصیت کے نقوش واضح ہونے لگے۔ ۲۶ سالہ گرامچی نے انقلابی روس سے کسی نہ کسی طرح موصول ہونے والا مواد جمع کر کے ان کے تراجم "الگریدو" میں شایع کیے۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ گرامچی کے تین بھائی گنارو، کارلو اور ماریو بھی فوج میں تھے، لیکن خوش قسمتی سے وہ

تینوں اس خون آشام جنگ سے زندہ بچ کر آ گئے۔ گنارو اور کارلو نے فوج کو خیرباد کہا، جبکہ گرامچی کے تیسرے بھائی ماریو نے فوج میں رہنا پسند کیا۔ گنارو کالیاری کی اسی کوآپریٹیو سوسائٹی میں کام کرنے لگا، جہاں وہ جنگ سے پہلے کام کر رہا تھا۔ کارلو ماں باپ کے پاس گلرزا واپس آ گیا۔ اُس وقت گرامچی کی دو بہنیں گریزیتا اور تیریسینا بھی ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھیں، جبکہ تیسری بہن، ایما ایک قریبی مقام پر ایک ڈیم کی تعمیر کرنے والی کمپنی میں ملازمت کر رہی تھی۔ معاشی لحاظ سے اب ان کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ صحافی کی حیثیت سے گرامچی نے جو کامیابی حاصل کی تھی، اس پر اس کے گھر والے کچھ کچھ فخر محسوس کرنے لگے تھے، حالانکہ گرامچی جو کچھ لکھتا تھا، وہ ان کے کچھ خاص پلّے نہیں پڑتا تھا۔ دنیا کو بدلنے کی باتیں انھیں کسی اور کرۂ ارض کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ گرامچی کے مضامین پڑھ کر اُس کا باپ، سیسلو کبھی کبھی نہایت چراغ پا ہوتا تھا۔ یہ مضامین پڑھ کر وہ بڑبڑانے لگتا تھا، لیکن گرامچی کی ماں یہ کہہ کر اس کی بڑبڑاہٹ کو ختم کر دیتی تھی: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں جانتی ہوں، مگر کیا کیا جائے . . . وہ چیزوں کو اسی طرح دیکھتا ہے . . ."

۵ دسمبر ۱۹۱۸ء سے گرامچی نے "اوانتی" میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اب گرامچی میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی اور جولانی تھی۔ اسے اپنی جسمانی معذوری کا احساس بھی اتنا نہیں ستاتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ تاسکا، تو گلیاتی اور تراسینی کے تورین واپس آتے ہی ان سب ساتھیوں نے گرامچی کے ساتھ مل کر ایک نیا ہفتہ وار رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس پورے عرصے میں گرامچی لینن کی تقریروں اور روسی لٹریچر کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اس رسالے "لااوردائن نووو" کا پہلا شمارہ نکلا۔

اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ گرامچی اور اُس کے ساتھیوں نے تورین کے محنت کش طبقہ کو نہ صرف رُوس کے حالات سے روشناس کرایا، بلکہ انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ تورین کے مزدوروں کو روسی طرز پر کارخانوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لینے پر آمادہ کیا۔ مزدوروں میں یہ تحریک غیر معمولی حد تک مقبول ہوئی اور کار بنانے والے کئی کارخانوں میں مزدوروں کی کمیٹیاں وجود میں آ گئیں اور تیس ہزار مزدور اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ان کمیٹیوں نے کارخانوں کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کارخانوں کے مالکان اور مزدوروں میں تصادم ناگزیر ہو گیا۔ یہ تصادم مزدوروں کی اس تحریک کی ناکامی کی صورت میں نکلا، کیونکہ بحیثیت مجموعی سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ اس تجربہ کو قبل از وقت سمجھتی تھی اور باقی اٹلی کے مزدور تنظیمی سطح پر تورین کے مزدوروں کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے۔

اسی دوران اتحادی حکومتیں رُوس اور ہنگری کی انقلابی حکومتوں کے خلاف انقلاب دشمن تحریکوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ ۲۰، ۲۱ جولائی ۱۹۱۹ء کو روس اور ہنگری کی انقلابی حکومتوں سے اٹلی کے محنت کش طبقہ کے اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لیے ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ اس ہڑتال کے سلسلے میں دوسرے سوشلسٹ لیڈروں کے ساتھ گرامچی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی زندگی میں جیل کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ گرامچی جیل میں مختصر مدت تک ہی رہا، لیکن اس عرصہ میں بھی اُس نے ساتھی قیدیوں کے ذہنوں کو نئے خیالات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔

۱۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو اٹلی میں جنگ کے بعد پہلا عام چناؤ ہوا۔ چناؤ سے ایک ہفتہ پہلے سوشلسٹ پارٹی نے بولونا کے مقام پر اپنی کانگریس میں تھرڈ انٹرنیشنل سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس چناؤ میں سوشلسٹ پارٹی کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی اور اُس کے ۱۵۰ ممبر پارلیمنٹ کے لیے چُنے گئے، جبکہ پچھلی پارلیمنٹ میں اس کی صرف ۵۰ سیٹیں تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کی ممبرشپ بھی پچاس ہزار سے بڑھ کر تین لاکھ ہو گئی، جبکہ سوشلسٹ پارٹی کے تحت ٹریڈ یونینوں میں بیس لاکھ

سے زیادہ مزدور شامل تھے، لیکن سوشلسٹ پارٹی کی طاقت میں اس کی وجہ سے تنظیمی سطح پر نئے مسائل کھڑے ہوگئے اور پارٹی میں یہ خیال بھی قوی ہوگیا کہ اقتدار ایک پکے پھل کی مانند ایک نہ ایک دن اس کی گود میں آگرے گا۔ پارٹی کا دایاں اور بایاں بازو ایک دوسرے سے دست بگریباں تھا۔ دائیں بازو والے ہر صورت میں پارلیمانی راہ سے ہی اقتدار پر قبضہ کرنے کے حامی تھے، جبکہ پارٹی کا بایاں بازو پارلیمینٹ کے مکمل بائیکاٹ پر زور دیتا تھا۔ ان دو انتہا پسند نظریوں کے بیچ میں پارٹی کی لیڈرشپ تھی جو ٹھوس اور قابل پروگرام پیش کرنے کے بجائے، محض زبانی سطح پر انقلابی لفاظی پر یقین رکھتی تھی۔

اس مرحلہ پر گرامچی نے سوشلسٹ پارٹی کی صورتِ حال پر ایک رپورٹ تیار کی۔ یہ رپورٹ پارٹی کی تورین شاخ نے منظور کرلی اور پارٹی لیڈرشپ کے سوچ بچار کے لیے اوپر بھیج دی گئی۔

گرامچی کی اس رپورٹ میں کہا گیا تھا:

"سوشلسٹ پارٹی واقعات کی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ وہ ان واقعات کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے سے بھی گریز کرتی ہے۔ وہ ایسی پالیسیاں پیش کرنے سے بھی تہی دامن ہے، جنھیں عوام سمجھ سکیں اور قبول کرسکیں۔ پارٹی مارکسزم یا کمیونسٹ انٹرنیشنل کے انقلابی نظریات کا مؤثر استعمال کرنے سے قاصر ہے اور نہ وہ کوئی ایسی عام حکمتِ عملی نافذ کر پارہی ہے، جو انقلابی سرگرمیوں کو ایک مرکز پر مجتمع کر سکے۔ محنت کش طبقے کے منظم ہیش رو دستے کی حیثیت سے پارٹی کو ایسے مشترکہ اقدام کو تقویت دینے کی کوشش کرنی چاہیے، جس سے مزدور ایسا انقلاب لانے میں کامیاب ہوسکیں، جو قائم و دائم رہ سکے ... اس کے بجائے بولونا کانگریس کے بعد بھی پارٹی محض ایک پارلیمانی پارٹی بنی ہوئی ہے، جو بورژوا جمہوریت کی حد بندی میں قید ہے ..."

گرامچی کی اس رپورٹ کا اہم ترین حصہ وہ ہے، جس میں اس نے فاشزم کے خطرہ کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

"اٹلی میں طبقاتی جدوجہد کا موجودہ دور، ایک ایسا دور ہے، جو یا تو انقلابی پرولتاریہ کے اقتدار پر قبضہ کے لیے راہ تیار کرتا ہے یا صاحبِ جائداد اور حکمران طبقے کے وحشیانہ ردِ عمل کا دور ثابت ہوتا ہے۔ یہ حکمران طبقہ صنعتی اور زرعی پرولتاریہ کے خلاف کسی بھی قسم کے تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کرے گا۔ یہ طبقہ مزدوروں کی سیاسی جدوجہد کے ذرائع کے ساتھ سوشلسٹ پارٹی کو ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے اور مزدوروں کے معاشی طاقت کے ذرائع یعنی ٹریڈ یونینوں اور کوآپریٹو انجمنوں کو بورژوا ریاست کی مشینری میں ضم کرنے

کی کوشش کریں گے۔"

جس وقت گرامچی نے یہ نوٹ لکھا تھا، اسی وقت ہی تورین کے مزدوروں کی کارخانوں میں نظم ونسق سنبھالنے کی تحریک ناکامی سے دوچار ہوئی تھی۔ حکومت اور کارخانے داروں نے مزدوروں کی تحریک کو ہر صورت میں کچل دینے کا فیصلہ کرلیا اور تورین کو فوجی قلعے کا روپ دے دیا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۲۰ء کو ماسکو میں تھرڈ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس شروع ہوئی۔ اُس وقت تک رُوس میں سُرخ فوج انقلاب دشمن طاقتوں کو شکست دے چکی تھی، لیکن جرمنی میں جنوری ۱۹۱۹ء میں فوج اور سوشل ڈیموکریٹوں کے گٹھ جوڑ نے اسپارٹکسٹ انقلاب کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ روزا لکسمبرگ اور کارل لیب نیخت وہاں قتل کیے جا چکے تھے، جبکہ ہنگری میں بیلا کن کی کمیونسٹ حکومت کا بھی ایک ایسے ہی گٹھ جوڑ نے تختہ پلٹ دیا تھا اور وہاں امیر البحر ہورتھی کی حکومت انقلابیوں کو چُن چُن کر قتل کر رہی تھی۔

اس پس منظر میں، تھرڈ انٹرنیشنل نے روس میں انقلاب کی کامیابی اور ہنگری اور جرمنی میں انقلابات کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوشل ڈیموکریٹوں کو بین الاقوامی انقلابی تحریک سے نکال باہر کیا جائے۔ اٹلی کے جس وفد نے کانگریس میں شرکت کی تھی، اگرچہ اس میں گرامچی یا "لا اور دائن نوود" کے نظریات کی نمائندگی کرنے والا کوئی فرد شامل نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس کانگریس نے گرامچی اور "لا اور دائن نوو" کے نظریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ لینن نے اس کانگریس کے سامنے جو پروگرام پیش کیا تھا، اس کا سترہواں نکتہ یہ تھا:

> "اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کے بارے میں، دوسری کانگریس، ۸ر مئی ۱۹۲۰ء کو پارٹی کی تورین شاخ کی طرف سے "لا اوردائن نوود" میں شایع شدہ پارٹی کے تنقیدی جائزے اور عملی تجاویز سے مجموعی طور پر اتفاق رائے کا اظہار کرتی ہے، کیونکہ یہ تھرڈ انٹرنیشنل کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔"

اس طرح لینن اور تھرڈ انٹرنیشنل کی اس دُوسری کانگریس نے گرامچی اور "لا اور دائن نوود" کے نظریات پر مُہر تصدیق ثبت کردی تھی۔

اگست ۱۹۲۰ء میں تُورین کے مزدوروں اور کارخانے داروں کے درمیان ایک اور تصادم ہوا۔ ۳۱ر اگست کی رات کو کارخانوں کے مالکان نے لاک آوٹ کا اعلان کر دیا، لیکن اگلے دن مزدوروں نے کارخانوں میں داخل ہو کر ان پر قبضہ کرلیا اور کلرکوں اور تیکنیکی ماہرین کی غیر حاضری کے باوجود، مزدوروں نے کارخانوں میں پیداوار کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ اس دوران، "لا اور دائن نوود" نے اشاعت کا سلسلہ بند کر دیا تھا، کیونکہ گرامچی اور اس کے ساتھی کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ صلاح مشوروں کے ذریعہ کارخانوں میں کام کاج جاری رکھنے کے مسائل پر اپنی توجہ صرف کر رہے تھے۔ لیکن آخر کار مزدوروں کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اس بار بھی ناکامی کے اسباب وہی تھے، جن کی وجہ سے اپریل ۱۹۱۹ء کی ہڑتال ناکام ہوئی تھی۔

اس مرحلہ پر اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی اصلاح پسندوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کے اخراج کے مسئلہ میں الجھی ہوئی تھی۔ اس دوران ہی اٹلی میں نومبر۔ اکتوبر میں مقامی انتخابات منعقد ہوئے تھے اور سوشلسٹ پارٹی نے ۶۹ میں سے ۲۶ صوبوں اور ۸۰۰۰ میونسپل کمیٹیوں میں سے ۲۱۶۲ کمیٹیوں میں اکثریت حاصل کی، جن میں میلان اور بولونا جیسے بڑے شہروں کی میونسپل کمیٹیاں شامل تھیں۔ ۲۱ نومبر بولونا کا نیا سوشلسٹ میئر ٹاؤن ہال کی بالکنی میں بھیڑ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے پہونچا تو ایک مسلح فاشسٹ گروہ نے اچانک ایک اونچی جگہ سے بھیڑ پر اندھادھند گولیاں برسانا شروع کردیں۔ ٹاؤن ہال کی کھڑکی سے بھیڑ پر دستی بم بھی پھینکے گئے۔ فاشسٹوں کی اس دہشت انگیزی کی وجہ سے ۶۸ افراد ہلاک ہوگئے۔ اس قسم کے واقعات عام ہوتے جارہے تھے اور سوشلسٹوں کی محدود مدافعت کے باوجود فاشسٹوں کی دہشت انگیزی کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

ایسی صورتِ حال میں، جبکہ فاشسٹوں کی دہشت انگیزی کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں، سوشلسٹ پارٹی میں پھوٹ اور انتشار خودکشی کے مترادف ہوتا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے حامی پارٹی کے اندر رہتے ہوئے اور پارٹی اور محنت کش طبقہ کے اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے پوری پارٹی کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔ ۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء کو لورنو میں اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کی ساتویں کانگرس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں اٹلی کے محنت کش طبقہ یا صحیح معنوں میں اُن کے لیڈروں نے تھرڈ انٹرنیشنل کی رہنمائی قبول نہیں کی۔ ۹۸۰۰۰ ووٹوں کے بل بوتے پر سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ سیراٹی کے ہاتھوں میں رہی، جبکہ ۵۸۰۰۰ ممبروں نے تھرڈ انٹرنیشنل کی حمایت کی اور ۱۴۰۰۰ نے اصلاح پسندوں کی تائید کی۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۱ء کو گرامچی کی ۳۰ ویں سالگرہ سے ایک دن قبل سوشلسٹ پارٹی کے کمیونسٹ ارکان کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی عالمِ وجود میں آگئی۔ امادیو بوردیگا کو پارٹی کا سکریٹری چُنا گیا۔ پندرہ ارکان پر مشتمل مرکزی کمیٹی بھی چُنی گئی، جن میں گرامچی بھی شامل تھا۔

یکم جنوری ۱۹۲۱ء سے "لا اوردائن نووو" ہفتہ وار سے روزنامہ بن گیا تھا۔ اس کا ایڈیٹر اب بھی گرامچی ہی تھا۔ اب یہ اخبار پارٹی کا ترجمان تھا۔ گرامچی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ گرامچی بوردیگا کی گروہ بندی کی پالیسی سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود، پارٹی لائن پر عمل کررہا تھا۔ پارٹی لائن یہ تھی کہ اٹلی میں فاشسٹ یا فوجی ڈکٹیٹرشپ ممکن نہیں ہے۔ لیکن گرامچی حالات کا معروضی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ اٹلی میں رجعت پسند اور فاشسٹ طاقتیں متحد ہورہی ہیں۔ گرامچی کا خیال تھا کہ اس خطرہ کے خلاف کمیونسٹوں کو سبھی ہم خیال عناصر سے اتحاد کرنا چاہیے لیکن گرامچی نے ان خیالات کا اظہار مرکزی کمیٹی کی میٹنگوں میں نہیں کیا۔ گرامچی نے شاید اس وجہ سے نکتہ چینی کرنے سے احتراز کیا کہ اس نکتہ چینی کی وجہ سے خود کمیونسٹ پارٹی میں مزید انتشار نہ پھیل جائے۔

کمیونسٹ پارٹی نے اپنی دوسری کانگرس میں، جو مارچ ۱۹۲۲ء میں روم میں منعقد ہوئی، گرامچی کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایکزیکیوٹیو میں اطالوی پارٹی کا نمائندہ نامزد کیا ۔۔۔۔۔ مئی کے اواخر میں گرامچی ماسکو روانہ ہوگیا۔

گرامچی ماسکو پہونچا تو اس کی صحت بڑی دگرگوں تھی۔ سیاسی اور ذاتی مسائل کا تناؤ ایک ساتھ اپنا اثر دکھانے لگے اور گرامچی کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کے صدر کے مشورہ پر ماسکو کے نواح میں واقع ایک سینی ٹوریم میں داخل کردیا گیا۔ یہاں گرامچی کی ملاقات یوجینی شوشٹ سے ہوئی۔ جو عمر میں گرامچی سے کچھ سال بڑی تھی اور وہ اطالوی زبان فراٹے سے بولتی تھی۔ یوجینی کا باپ پرانا انقلابی تھا اور زارشاہی نے اسے سائبیریا جلاوطن کردیا تھا۔ وہیں یوجینی کی پیدائش ہوئی تھی۔ بعد میں

یوجینی کے باپ نے جلاوطنی کے کئی سال فرانس اور اٹلی میں بتائے تھے۔

یوجینی کی چھوٹی بہن جولیا اُس سے ملنے سینی ٹوریم آیا کرتی تھی۔ گرامچی نے اپنے سرد دِل میں محبت کا پہلا گرم جھونکا محسوس کیا اور اس کا سارا وجود تھرتھرا اُٹھا۔ اب تک گرامچی اپنے ذہن میں ہی جیا تھا اور اُس نے اپنی جسمانی معذوری کے باعث کبھی یہ سوچا تک نہیں تھا کہ کوئی اس سے محبت کر سکتا ہے۔ ۲۶ سالہ حسین جولیا نے گرامچی کے نحیف جسم کے باوجود، اس کی آنکھوں کی چمک میں غیر معمولی توانائی کا احساس کیا ——— اور وہ دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس تجربہ نے گرامچی کے دل و دماغ پر خوشگوار اور گہرے اثرات مرتب کیے۔ گرامچی نے اپنے ان احساسات کو جولیا کے نام اپنے ایک خط میں یوں بیان کیا ہے:

> "میں نے کتنی بار یہ سوچا ہے کہ کیا کسی ایسے آدمی کے لیے لوگوں کے ایک جمِ غفیر سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہے، جس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی ہو، اپنے والدین تک سے جو محبت نہ کر سکا ہو؟ کیا انسانوں کے ایک مجموعہ سے محبت کرنا ممکن ہے، جبکہ خود اس سے کسی نے انفرادی سطح پر گہری محبت نہ کی ہو؟ کیا اس بات نے بحیثیت سیاسی کارکن میری زندگی کو متاثر نہیں کیا ہے؟ کیا اس نے مجھے خشک دماغ نہیں بنایا اور بحیثیت انقلابی میری حیثیت کو کم نہیں کیا ہے اور جس نے مجھے محض ایسا انقلابی بنایا ہے، جو ہر چیز کو خالص ذہن، محض حسابی سطح پر دیکھتا ہے؟ میں نے ان سب باتوں کے بارے میں کافی سوچا ہے، اور پچھلے کچھ دنوں میں تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئی ہیں ——— یہ سوچتے ہوئے کہ تم کس طرح میری زندگی میں آئیں اور تم نے مجھے محبت دی، ایک ایسی شے جس سے میں ہمیشہ محروم رہا ہوں۔ یہی وہ محرومی تھی، جس نے مجھے تنک مزاج اور ترش رو بنا رکھا تھا۔۔۔"

اُدھر اٹلی میں ٹریڈ یونین اور کوآپریٹیو انجمنوں کے دفاتر پر فاشسٹوں کے حملوں کی شدت اور تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو کمنترن کی چوتھی کانگریس ماسکو میں شروع ہوئی۔ اٹلی میں فاشسٹ برسرِ اقتدار آ چکے تھے اور اٹلی کے شمالی اور وسطی صنعتی خطوں میں بائیں بازو کے رہنماؤں کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا اور انھیں فاشسٹ مسلح گروہ بنا روک ٹوک قتل کر رہے تھے۔ کمنترن نے اس مسئلہ پر غور کیا اور زنوویئف، بخارن اور دوسرے سربرآوردہ بالشویکوں نے یہی رائے ظاہر کی کہ اٹلی کے محنت کش طبقہ اور سبھی جمہوری پارٹیوں کو متحد ہو کر فاشسٹ حملوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ اتحاد اب امکان کی حدود میں بھی تھا، کیونکہ اکتوبر میں اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی اصلاح پسندوں کو پارٹی سے خارج کر چکی تھی، لیکن کمنترن کے اس مشورہ کو اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی اب بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ مسولینی اور فاشسٹ پارٹی کا برسرِ اقتدار آنا ایک بورژوا حکومت

کی جگہ دوسری بورژوا حکومت کے قیام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، حالانکہ اس وقت اٹلی میں بورژوا جمہوریت کی جگہ بورژوا ڈکٹیٹرشپ قائم کی جارہی تھی۔

گرامچی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر امادیو بوردیگا کی علیحدگی پسندی کی پالیسی کا مخالف تھا لیکن گرامچی کو خدشہ تھا کہ اس مرحلہ پر بوردیگا کی مخالفت کی گئی تو اس کے غیر متوقع نتائج نکل سکتے ہیں اور پارٹی مزید پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن اپنی اس رائے کے باوجود گرامچی نے کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کے اُس بازو کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، جو کمنترن کا حامی تھا۔ دونوں پارٹیوں میں اتحادی رشتہ قائم کرنے کے لیے ایک چودہ نکاتی تجویز تیار کی گئی اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ بوردیگا نے اس کمیٹی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تو اس کی جگہ گرامچی کو نامزد کیا گیا۔

لیکن گرامچی اٹلی واپس نہ جا سکا۔ مشترکہ کمیٹی کے سوشلسٹ رکن سیراتی کو اٹلی واپس پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا، جبکہ ایک اور رکن تاسکا کو فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینا پڑی۔ گرامچی ماسکو میں ہی مقیم رہا۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے جولیا اور اُس کی ملاقاتیں پل بھر کی ملاقاتیں بن کر رہ گئی تھیں۔

۳ فروری ۱۹۲۳ء کو اٹلی میں بوردیگا اور دوسرے اہم کمیونسٹ لیڈر بھی گرفتار کر لیے گئے۔ کمنترن نے اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد جون ۱۹۲۳ء کو اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ سنبھالنے کے لیے ایک نئی ایگزیکٹیو کمیٹی نامزد کی، لیکن ستمبر کے مہینے میں اس نئی ایگزیکٹیو کمیٹی کے سب ارکان میلان میں اس وقت گرفتار کر لیے گئے جب ایک مزدور کے گھر میں ان کی میٹنگ چل رہی تھی۔ کمنترن نے گرامچی کو ماسکو سے وائنا بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اٹلی کی سرحدوں سے قریب رہ کر اٹلی کی پارٹی کی صورتِ حال پر نظر رکھ سکے اور اس بحرانی دور میں اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس طرح کم سے کم کمنترن کی نظر میں گرامچی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کا سب سے ذمہ دار لیڈر بن گیا۔ اس وقت گرامچی کی عمر بتیس سال تھی۔

جولیا کو ماسکو میں چھوڑ کر گرامچی نومبر ۱۹۲۳ء کے اواخر میں وائنا پہنچا۔ ماسکو میں گرامچی کا قیام ڈیڑھ سال تک رہا تھا اور اس قیام نے گرامچی کے دل و ذہن پر ناقابلِ مندمل اثرات چھوڑے تھے۔ وائنا میں گرامچی گمنام خفیہ اور الگ تھلگ زندگی جینے پر مجبور تھا، کیونکہ بصورتِ دیگر اس کے پکڑے جانے کا خدشہ تھا۔ تنہائی کا احساس گرامچی کے دل و دماغ کو ایک بار پھر ڈسنے لگا اور اسے جولیا کی جدائی شاق گزرنے لگی۔ جولیا کے نام اپنے خطوط میں گرامچی نے بار بار اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس وائنا آجائے تاکہ جدائی کے یہ تکلیف دہ دن اور راتیں ختم ہو جائیں، لیکن جولیا اپنے گھر بار کی الجھنوں کی وجہ سے وائنا آنے سے معذور تھی۔ اعصابی کمزوری کے علاوہ، اس وقت جولیا حاملہ تھی اور جب گرامچی کو جولیا کے خط میں اس کی اطلاع ملی تو اُسے جولیا کی جدائی اور بھی کھلنے لگی۔

وائنا میں ساڑھے پانچ مہینے کے قیام کے دوران گرامچی نے انتھک کوشش کی کہ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے مختلف گروہ آپس میں متحد ہو سکیں اور اٹلی کی دوسری جمہوریت پسند طاقتوں کے اشتراک و تعاون سے فاشزم کے اُس خطرہ کا مقابلہ کر سکیں، جو اب واہمہ سے سنگین حقیقت بن چکا تھا۔ فاشزم نے اپنی پوزیشن کافی مستحکم کر لی تھی اور طاقت کے اس استحکام کے بعد فاشزم کے سائے میں ۶ راپریل کو پارلیمانی چناؤ ہوئے تھے۔ گرامچی بھی ایک حلقہ انتخاب سے اُمیدوار تھا اور غیر حاضری کے باوجود گرامچی کو عوام کی تائید و حمایت حاصل ہوئی تھی اور اُسے ایک حلقہ انتخاب سے

نمائندہ چُن لیا گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو قوانین کے تحت گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پارلیمانی تحفظ کی رُو سے گرامچی گرفتاری سے محفوظ تھا۔ چنانچہ، گرامچی دو سال کی غیر حاضری کے بعد اٹلی واپس پہنچا اور اُسے پچھلے دو سال کے خون آشام واقعات کا ذاتی طور پر علم ہوا۔ خود گرامچی کا بھائی گنارو فاشسٹوں کے تشدد کا شکار ہوا تھا اور اُس نے فرار ہو کر فرانس میں پناہ لی تھی۔

فاشزم کے عروج کے باوجود، اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی شدید اختلافات اور گروہ بندی کا شکار تھی۔ بورڈیگا اب پارٹی کا لیڈر نہیں رہا تھا، لیکن پارٹی پر اب بھی اس کا اثر و نفوذ باقی تھا۔ صورتِ حال حوصلہ شکن تھی، مگر گرامچی نے پھر بھی پارٹی کو متحد کرنے کا بیڑہ اُٹھایا، کیونکہ گرامچی کا یہ عقیدہ تھا کہ افکار و خیالات میدانِ عمل میں ہی اپنی توانائی اور کھرا پن ثابت کرتے ہیں۔

گرامچی کی واپسی کو ایک مہینہ بھی نہیں بیتا تھا کہ پارلیمنٹ کے سوشلسٹ رُکن، میتوتی کو پُراسرار طریقے سے غائب کر دیا گیا۔ فاشسٹ حکومت کی پولیس نے اخبارات کو وارننگ دی کہ اس گمشدگی کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ کی جائے۔ میتوتی نے پارلیمنٹ میں فاشسٹ دہشت انگیزی کی شدید مذمت کی تھی۔ میتوتی نے مسولینی پر الزام لگایا کہ اگر فاشسٹ چناؤ میں کامیاب نہ ہوتے تو مسولینی نے تشدد استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس پر فاشسٹ بنچوں سے شور اُٹھا تھا: "ہاں، ہاں!" اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد جب میتوتی بیٹھا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "تم لوگ میرے جنازہ پر کی جانے والی تقریر تیار کر لو۔" چند دن بعد ہی میتوتی کو فاشسٹوں کے ایک مسلح غول نے ہلاک کر دیا اور اس کی لاش روم سے پندرہ میل دُور ایک جنگل میں دفن کر دی گئی، جس کا پتہ دو مہینے بعد ہی مل سکا۔

میلان سے شائع ہونے والے "لا یونیٹا" کو بھی پولیس نے میتوتی کی گمشدگی کے بارے میں کوئی خبر نہ چھاپنے کی دھمکی دی تھی۔ پولیس کے استبداد کے خطرے کے علاوہ، اخبار کے دفتر کے باہر سیاہ پوش فاشسٹ ٹولیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ گرامچی نے اس اخبار کے ایڈیٹر کو روم سے ٹیلی فون کیا۔ گرامچی نے ہدایت کی کہ اس معاملے پر فاشسٹ حکومت پر سخت ترین حملہ کیا جانا چاہیے۔ اگلے دن اخبار شائع ہوا تو اُس کی شاہ سُرخی تھی: "قاتلوں کی اس حکومت کو ختم کر دو!"

اس واقعہ اور خبر نے فاشسٹ دہشت انگیزی کے خلاف عوام کے سلگتے ہوئے جذبات میں آگ لگا دی اور عوام کے سلگتے ہوئے یہ جذبات غیظ و غضب کی صورت میں اُبل پڑے اور وہ فاشسٹ دہشت انگیزوں پر پل پڑے، لیکن عوام کے اس غیظ و غضب کو کنٹرول اور منظم کرنے والی کوئی طاقت اٹلی میں نہیں تھی۔

فاشسٹوں کی اس دہشت انگیزی کی مخالفت کرنے والی مختلف پارٹیاں بھی بطور احتجاج صرف پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کرنے پر ہی متفق ہو سکیں، لیکن یہ پارٹیاں ایک دوسرے کی اتنی ہی مخالف تھیں، جتنی کہ فاشزم کی۔ ان پارٹیوں کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی تھی کہ یہ سب پارٹیاں سوشلزم کی بھی کٹر مخالف تھیں۔ اُدھر سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے بیچ الگ سے ایک کھائی حائل تھی۔

اس طرح فاشسٹوں کو مخالف قوتوں کے کسی متحدہ محاذ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گرامچی نے پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کرنے والی پارٹیوں کے سامنے ملک گیر پیمانے پر سیاسی ہڑتال کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن ان پارٹیوں نے گرامچی کی تجویز کو ٹھکرا دیا، کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ اس ہڑتال کی لیڈرشپ کمیونسٹوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ کمیونسٹ پارٹی کی علیحدگی پسندی اور انتہا پسندی نے بھی ان پارٹیوں کو اس سے متنفر اور خوفزدہ کر رکھا تھا، کیونکہ بورڈیگا بدستور اپنے اس عقیدہ پر قائم تھا کہ

کمیونسٹ پارٹی کا مقصد ڈکٹیٹرشپ کا قیام ہے اور کمیونسٹ پارٹی کی بورژوا جمہوریت کی بحالی کے لیے کسی سے کوئی تعاون واشتراک نہیں کرنا چاہیے، جبکہ گرامچی جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے کوشاں تھا۔

ان سیاسی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف رہنے کے باوجود، گرامچی نے جُولیا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ جُولیا کو اب بھی محبت بھرے خطوط لکھتا تھا۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۴ء کو جولیا نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا، لیکن گرامچی کو دو ہفتے بعد خبر ملی کہ وہ ایک لڑکے کا باپ بن گیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد جُولیا سے جدائی کا غم گرامچی کے لیے دوگنا ہو گیا۔

فاشسٹ حکمرانوں کے خلاف عوام کے غیظ و غضب کے غیر منظم مظاہرے سے گرامچی بھی کچھ عرصہ کے لیے اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ فاشزم اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے۔ گرامچی نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی تھی، جس میں اسی خوش فہمی کا اظہار کیا گیا تھا، جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ فاشسٹ ایک بار پھر سنبھل گئے تھے اور غیر منظم اور غیر مؤثر اپوزیشن اُن کے ہوش ٹھکانے لگانے میں ناکام رہی تھی اور فاشسٹوں نے اپنے مخالفین کو ایک بار پھر تشدد و دہشت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جوابی کارروائی کے طور پر، روم میں پارلیمنٹ کے ایک فاشسٹ ممبر، ارماندو کاسالینی کو ایک نوجوان نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

گرامچی کی نقل و حرکت محدود ہو گئی، کیونکہ فاشسٹ پولیس اب دن رات اس کی "نگرانی" کرنے لگی تھی۔ پھر بھی گرامچی چھپ چھپا کر خفیہ میٹنگوں میں شامل ہونے کا موقع نکال لیتا تھا۔ اسی دور میں اسے ایک بار دس دن کے لیے اپنے گھر، گلرزا جانے اور ماں باپ، بھائی، بہنوں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ یہ ملاقات اس کی آخری ملاقات ثابت ہونے والی تھی۔

جولائی ۱۹۲۵ء میں گرامچی نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی، جس میں کہا گیا تھا:

> "کیا فاشزم اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ممکن ہے؟ ... اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ... اپنی تنظیمی نوعیت کے اعتبار سے بھی فاشزم برابری کی سطح پر تعاون و اشتراک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ فاشزم کے تحت کوئی نمائندہ اسمبلی وجود میں نہیں آسکتی۔ فاشسٹ حکومت ہر اسمبلی کو ایک مسلح کیمپ کی شکل دے دیتی ہے یا اُسے رنڈی خانے کا ایسا بغلی کمرہ بنا دیتی ہے جو سب سے نچلی سطح کے بدمست گاہکوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے ..."

کچھ جمہوری پارٹیاں اب بھی اس غلط فہمی کا شکار تھیں کہ فاشسٹوں کی دہشت انگیزی میں مسولینی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ بس، فاشسٹ پارٹی سے چند انتہا پسندوں کا اخراج ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا مگر، ۳ دسمبر کو مسولینی نے اس غلط فہمی کو صاف اور کھلے الفاظ میں پارلیمنٹ کے سامنے دُور کر دیا۔ اس وقت تک مسولینی زبانی طور پر آئین اور قانون کی قسمیں کھاتا تھا اور عملی سطح پر قانون اور آئین کے خلاف اپنے حواریوں کی تمام سرگرمیوں کی تائید و حمایت کرتا تھا، لیکن مسولینی نے اپنے اس دوغلے پن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پارلیمنٹ کے سامنے اعلان کیا:

> "میں یہاں، اس وقت تمام اطالوی عوام کے ... اور اس اسمبلی کے سامنے اعلان کرتا

ہوں کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کی سیاسی، اخلاقی اور تاریخی ذمہ داری میں اور صرف میں قبول کرتا ہوں۔ اگر فاشزم ایک مجرمانہ سازش ہے تو سب سے بڑا سازشی میں ہوں۔"

اس دریدہ دہن اعلان کے تین دن کے اندر اندر ۳ سے ۶ جنوری ۱۹۲۵ء کے دوران، کئی سیاسی تنظیموں اور ان کی شاخوں پر فاشسٹ پولیس نے تالے ڈال دیے۔ اسی عرصہ میں ساڑھے چھ سو سے زیادہ رہائشی گھروں کی تلاشی لی گئی اور سینکڑوں لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اپوزیشن کے اخبارات کے دفاتر پر تالے ڈالے جانے لگے۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو ماسکو میں کمنترن کی ایگزیکیٹو کی میٹنگ منعقد ہونے والی تھی۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے وفد کی قیادت گرامچی کو سونپی گئی۔ گرامچی فروری کے اواخر میں ماسکو پہنچا۔ وہ جولیا سے ڈیڑھ سال بعد اور اپنے بچے دلیو سے پہلی بار ملا۔ ماسکو پہنچنے کے بعد ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس سے گرامچی کافی متاثر ہوا۔ گرامچی اور جولیا نے بچے کی ڈاکٹری کو ایک خوبصورت تصویر پینٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تصویر پر گرامچی اور جولیا نے دستخط کیے۔ جولیا کی بہن یوجینی نے، جو سینی ٹوریم میں گرامچی کے ساتھ زیر علاج رہی تھی، جولیا کے دستخط کے نیچے اپنے دستخط کر کے نیچے لکھ دیا: " دونوں ماؤں کی طرف سے " ظاہر ہے یوجینی اپنے اعصابی مرض سے کلی طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی اور وہ خود کو بچے کی ماں سمجھتی تھی۔

کمنترن نے اس کانگریس میں بھی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کو اٹلی کی جمہوریت پسند اور فاشزم دشمن طاقتوں سے اتحاد قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ گرامچی ۲۸ اپریل کو اٹلی واپس آ گیا۔ اس وقت حکومت فری میسن تنظیم پر پابندی لگانے کے لیے قانون کا مسودہ تیار کر رہی تھی، لیکن اس قانون کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ حکومت کسی بھی تنظیم پر اس قانون کی مدد سے پابندی لگا سکتی تھی۔

۱۶ مئی ۱۹۲۵ء کو گرامچی پارلیمنٹ میں افتتاحی تقریر کرنے کے لیے داخل ہوا۔ مسولینی اور گرامچی کے درمیان یہ پہلا آمنا سامنا تھا۔ مسولینی، جو ۱۹۱۴ء تک سوشلسٹ اخبار " اوانتی " کا ایڈیٹر رہا تھا۔ دونوں اس سے پہلے ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے، کیونکہ گرامچی کی تحریریں " لا اوردائن نوو "، کے علاوہ " اوانتی " کے تورین ایڈیشن میں بھی شایع ہوتی تھیں، لیکن مسولینی اب فاشسٹ پارٹی کا لیڈر تھا اور گرامچی پارلیمنٹ میں بائیں بازو کی اپوزیشن کا لیڈر۔

گرامچی بلند بانگ مقرر نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود جب گرامچی نے اپنی دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا تو پارلیمنٹ کے فاشسٹ ممبر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اگلے دن روم کے اخباروں میں مسولینی کا ایک فوٹو شایع ہوا، جس میں وہ آگے جھکا ہوا، کان پر ہاتھ رکھے گرامچی کی تقریر سن رہا تھا۔ گرامچی نے فری میسن پارٹی اور فاشزم کی طبقاتی نوعیت کا تارو پود بکھیرا اور کہا کہ " فری میسن پارٹی اور فاشسٹ پارٹی میں کوئی بنیادی طبقاتی فرق نہیں ہے، بنیادی طور پر دونوں پارٹیاں ایک ہی طبقے کی پارٹیاں ہیں۔ فری میسن پارٹی شہری بورژوا طبقہ کی نمائندہ ہے، جبکہ فاشزم دیہی بورژوا طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ اس بنا پر فری میسن اقتدار کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ لینا چاہتا ہے کہ فری میسن حکمران طبقہ اس کشمکش میں محنت کش طبقہ پر وہ سختی نہیں کر رہا، جو اسے کرنی چاہیے " گرامچی نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ فری میسن

پارٹی بالآخر فاشسٹ پارٹی میں جذب ہو جائے گی :

"... چونکہ پوری کی پوری فری مین تحریک فاشسٹ پارٹی میں ضم ہو جائے گی اور اس کا ہی ایک حصہ بن جائے گی، اس لیے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس قانون کے ذریعہ مزدوروں اور کسانوں کو وسیع پیمانے پر منظم ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس قانون کا یہی مقصد ہے اور اس کے یہی معنی ہیں"

گرامچی کی تقریر کے دوران مسولینی اور دوسرے فاشسٹ ممبروں نے مداخلت کر کے گرامچی سے بحث شروع کرنا چاہی، لیکن اس قسم کے بحث مباحثہ میں پڑنے کے بجائے، گرامچی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا :

"آپ حکومت پر قابض ہو سکتے ہیں، آپ آئین میں تبدیلی کر سکتے ہیں، آپ تنظیموں کی ان صورتوں کو ختم کر سکتے ہیں، جن میں وہ اب تک کام کرتی رہی ہیں، لیکن آپ ان معروضی حالات پر حاوی نہیں ہو سکتے جو خود آپ کے افعال کا تعین کر رہے ہیں۔ آپ صرف پرولتاریہ کو نیا تنظیمی روپ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس فورم سے، ہم اٹلی کے محنت کش طبقہ اور کسانوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں : قوم کی انقلابی طاقتیں ہرگز تباہی کو قبول نہیں کریں گی اور آپ حضرات کا تاریک خواب کبھی حقیقت نہیں بن سکے گا۔"

گرامچی کے تقریر ختم کرتے ہی پارلیمنٹ میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پارلیمنٹ میں گرامچی کی یہ افتتاحی تقریر اس کی الوداعی تقریر بھی ثابت ہوئی، کیونکہ پارلیمنٹ میں محنت کش طبقہ کی نمائندگی کے دور کا خاتمہ قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ گرامچی کی تقریر سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اس خطرہ کا صریح احساس تھا۔ فاشزم کی دہشت انگیزی کی سیاہ کارروائیوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگریس جنوری ۱۹۲۶ء لیونز میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس کانگریس کے سامنے پیش کرنے کے لیے گرامچی اور تولگلیاتی نے ایک دستاویز تیار کی۔ اس دستاویز میں اٹلی کی اس وقت کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا :

"فاشزم کے تمام تر پروپیگنڈہ اور اس کے تمام تر سیاسی اور اقتصادی اقدامات کا رجحان امپریلزم کی ہی طرف ہے۔ یہ رجحان اٹلی کے زرعی، صنعتی حکمران طبقہ کی اس ضرورت کو ظاہر کرتا ہے کہ اٹلی کے سماج کے بحران کا حل، اٹلی کے باہر کسی سماج میں تلاش کیا جائے۔ اس رجحان میں ایک ایسی جنگ کے بیج پوشیدہ ہیں، جو بظاہر اطالوی توسیع کے لیے لڑی جائے گی، مگر جو اصلیت میں فاشسٹ اٹلی کو ان امپریلیسٹ گروہوں میں سے کسی ایک گروہ کے ہاتھ کا کھلونا بنا دے گی، جو دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔"

اس دستاویز میں اٹلی کی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام فاشزم کے ذریعہ استحکام حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس میں ان عوامی طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا، جو اس فاشزم دشمن جدوجہد میں محنت کش طبقہ کا ساتھ دیں گی۔ ساتھ ہی اس میں بورژوا طبقہ کی ان طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا جو حتمی

طور پر فاشزم سے ناطہ جوڑ چکی تھیں اور ان بورژوا طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا، جو فاشزم کے خلاف جدوجہد میں اشتراک وتعاون کر سکتی تھیں۔

اس بحرانی دور میں جب گرامچی کو یہ خبر ملی کہ جولیا روم آرہی ہے تو وہ خوش ہونے کے بجائے ہراساں ہوگیا، کیونکہ ان بحرانی حالات میں اس کا روم آنا خطرہ وخدشہ سے خالی نہ تھا۔ لیکن جولیا دلیو کو لے کر روم پہنچ گئی۔ اس نے روم میں روسی سفارت خانہ میں اس لیے ملازمت حاصل کرلی تھی کہ وہ گرامچی کے قریب رہ سکے، لیکن گرامچی نے اس خیال سے جولیا کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنا مناسب نہیں سمجھا کہ حکومت جولیا کا ویزا رد نہ کردے۔ پھر بھی وہ روزانہ کچھ نہ کچھ وقت جولیا اور دلیو کے ساتھ گزارتا تھا۔

جنوری ۱۹۲۶ء کے اواخر میں گرامچی سرحد پار کرکے فرانس پہنچا، جہاں لیونز میں کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی۔ کانگریس کے سامنے گرامچی کی دستاویز بھی پیش کی گئی اور گرامچی نے بائیں بازو کے انتہا پسندانہ رجحان کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا:

"کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے، جہاں پرولتاریہ اپنے طور پر اقتدار حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے کی پوزیشن میں ہو۔ چنانچہ، اسے ہمیشہ اتحادیوں کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسے ایسی پالیسی اپنانی چاہیئے، جس کے ذریعہ وہ سبھی سرمایہ دار دشمن طبقات کی لیڈرشپ حاصل کرسکے۔ اٹلی میں اس سوال کی خاص اہمیت ہے، کیونکہ وہاں پرولتاریہ ایک اقلیت ہے۔ اور جہاں وہ جغرافیائی لحاظ سے اس طرح منتشر ہے کہ وہ اس وقت تک اقتدار کے لیے کامیاب جدوجہد کی رہنمائی نہیں کرسکتا، جب تک وہ کسانوں کے طبقہ سے اپنے تعلق کے مسئلہ کو صحیح حل نہیں کرلیتا۔ فوری مستقبل میں ہماری پارٹی کو اس مسئلہ کی توضیح اور حل پر توجہ دینی چاہیئے۔"

گرامچی کی تجویز و دستاویز کے حق میں ۹۰ فی صد ووٹ ملے، جبکہ بوردیگا کے زیر اثر بائیں بازو کے انتہا پسندوں کو ۹،۲ فیصد ہی ووٹ مل پائے۔ بوردیگا نے انٹرنیشنل سے اپیل کی کہ کانگریس کے انعقاد میں بے ضابطگیاں ہوئی ہیں، مگر کمنترن نے اس اپیل کو رد کردیا۔

اٹلی میں حالات پیچیدہ اور سنگین ترین رخ اختیار کرتے جارہے تھے۔ ایک طرف فاشسٹوں کی دہشت انگیزی جاری تھی۔ دوسری طرف مسولینی پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا۔ ایک ۶۲ سالہ انگریز عورت، وائلٹ گبسن نے مسولینی پر گولی چلادی، لیکن اس کا نشانہ خطا گیا اور مسولینی کی ناک پر ہلکا سا زخم آیا۔ انتقامی کارروائی کے طور پر فاشسٹ جوانوں کے مسلح گروہوں نے دو آزاد اخبارات کے دفاتر نذر آتش کردیے۔

جولیا پیٹ سے تھی، لیکن بحران کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر ماسکو واپس نہ جاسکے تو کم سے کم روم سے باہر چلی جائے۔ چنانچہ اگست کے شروع میں جولیا، دلیو اور یوجینی روم سے روانہ ہوگئے۔ ۳۱ اگست کو ترانوتی کے مقام پر جولیا نے ایک اور لڑکے کو جنم دیا۔ ستمبر میں دلیو اپنی خالہ اور ماں کے ساتھ روس کے لیے روانہ ہوگیا۔ گرامچی

کو دوبارہ اپنے بیوی بچے کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ادھر اٹلی میں فاشزم کی تاریک قوتوں کی بہیمیت سے منتشر اور کمزور جمہوری اور عوامی طاقتیں نبرد آزما تھیں اور اُدھر سوویت روس میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ اس کشمکش نے اٹلی کے کمیونسٹوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو گرامچی نے اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکیٹو کی طرف سے سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو ایک خط لکھا، جس میں روس کی کمیونسٹ پارٹی سے دردمندانہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس نظریاتی بحث کے دوران صرف روس کے حالات کے بارے میں ہی نہ سوچیں بلکہ اس کشمکش کے بین الاقوامی اثرات کو بھی پیش نظر رکھیں۔

گرامچی کا خط موصول ہونے کے بعد، کمنترن نے روسی کمیونسٹ پارٹی میں جاری نظریاتی بحث کا پس منظر اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سامنے پیش کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ سوئٹزرلینڈ بھیجا، لیکن اس نمائندے اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے درمیان میٹنگ سے قبل، ۳۱ اکتوبر کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے حالات دگرگوں ہو گئے۔ اس دن بولونا میں مسولینی پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا اور اس حملے کا ذمہ دار اس بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کو گردانا گیا۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد، فاشسٹ دہشت انگیزی نے نہایت بھیانک رُوپ لے لیا۔ اور گرامچی اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کی نقل و حرکت نہایت محدود ہو گئی۔

۵ نومبر کو فاشسٹ حکومت نے بولونا کے واقعہ کا سہارا لے کر رہی سہی جمہوری آزادی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ تمام پاسپورٹ رد کر دیے گئے اور فاشسٹ دشمن اخبارات کو بند کرنے کے ساتھ ساتھ اُن پارٹیوں اور تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی، جو فاشزم کی مخالف تھیں۔

اس پابندی کے باوجود، گرامچی نے ۹ نومبر کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اُسی رات کو ساڑھے دس بجے فاشسٹ پولیس نے گرامچی کو حراست میں لے لیا۔ گرفتاری کے کچھ دن بعد گرامچی نے جولیا کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"تم کہا کرتی تھیں کہ ہم دونوں اتنے جوان ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے پروان چڑھتے دیکھنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اب بھی ہمیں اس اُمید کو تروتازہ رکھنا ہے اور جب بھی تم میرے بارے میں، بچوں کے بارے میں، سوچو تو تمہارے دل میں یہ اُمید تروتازہ ہونی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مستقل مزاج اور ثابت قدم رہو گی۔ ماضی سے بھی زیادہ، تاکہ بچوں کی معقول طریقے سے پرورش ہو سکے اور وہ تمہارے شایانِ شان ثابت ہو سکیں۔"

اور اس نے اپنی ماں کو لکھا:

میں نے تمہارے بارے میں پچھلے کچھ دنوں میں بہت زیادہ سوچا ہے۔ میں نے اس تازہ دکھ کے بارے میں بھی سوچا، جو اس عمر میں میں نے تمہیں پہنچایا ہے

اور اُن تمام دُکھوں کے بارے میں بھی، جو تُم اب تک سہہ چکی ہو۔ ان سب کے باوجود تمہیں چٹان کی سی مضبوطی سے اس کا سامنا کرنا ہے ـــــــــ مجھ سے زیادہ مضبوطی سے۔ اور تمہیں مجھے معاف کر دینا ہے، اپنی عظیم محبت کے تمام تر گداز اور نیکی کے ساتھ۔ میرے لیے یہ جاننا ہی مزید حوصلے کا باعث ہوگا کہ تُم اس دکھ کو صبر و تحمل اور استقامت کے ساتھ برداشت کر رہی ہو۔ ۔ میں پُرسکون ہوں۔ ذہنی طور پر میں کسی بھی چیز کے لیے تیار تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ جو بھی اذیتیں پیش آئیں، انھیں میں جسمانی سطح پر پورے تحمل کے ساتھ برداشت کر سکوں اور پُرسکون رہ سکوں ـــــــــ پیاری امّاں، سبھی پیارو، اس لمحے یہ سوچ کر میرا دل اور بھی بھاری ہو گیا ہے کہ میں تُم سب کو وہ محبت اور سُکھ نہیں دے سکا، جو مجھے دینا چاہیے تھا اور جس کے تُم سبھی مستحق تھے۔ اس کے باوجود، مجھے تُم لوگ جو بھی محبت دے سکو، دو اور مجھے یاد رکھو۔"

یہاں سے گرامچی کی زندگی کا، فاشزم کی کال کوٹھریوں میں وہ دس سالہ دور شروع ہوا، جس کے دوران انتونیو گرامچی نے فاشزم کی تاریک اور بہیمانہ قوّت کے خلاف جسمانی آزار اور صعوبتیں سہتے ہوئے اپنے ذہن کو ایک مشعل کی مانند فروزاں رکھا اور جس طرح فروزاں رکھا، وہ بجائے خود ایک الگ ولولہ انگیز داستان ہے اور ایک مزید مضمون کی محتاج۔

دس برس لمبی رات

اقبال اختر

۸ نومبر ۱۹۲۶ء کو رات کے ساڑھے دس بجے مسولینی کی فاشسٹ پولیس نے انتونیو گرامچی کو گرفتار کرلیا۔ فاشزم کی کال کوٹھریوں میں گرامچی کی یہ کالی رات دس سال، چار مہینے، ۱۹ دن لمبی تھی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کو صبح چار بجکر دس منٹ پر ذہن کی دُنیا کا یہ اسپارٹکس، جس کا ذہن زندگی کی تاریک ترین قوتوں کے خلاف ایک مشعل کی طرح فروزاں رہا تھا، سدا کے لیے خاموش ہوگیا۔ موت اور فاشزم کے جبر کے خلاف گرامچی کے نحیف و نزار، مختلف مہلک عوارض کے عرصہ دراز سے شکار جسم نے ایک ولولہ انگیز جدوجہد کے بعد ہی شکست تسلیم کی تھی، جبکہ اس کا باغی ذہن آخری لمحہ تک ایک برہنہ و روشن تلوار کی مانند تاریکی کے سینہ کو چاک کرنے کا کوشاں رہا تھا۔

گرامچی کو شہید بننے یا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا قطعی کوئی شوق نہیں تھا۔ گرفتاری کے کچھ دن بعد ہی گرامچی نے اپنی بیوی جولیا کی بڑی بہن تاتیانہ کے نام ایک خط میں شکایتی لہجہ میں لکھا تھا: ”مجموعی طور پر تم مجھے ایک ایسے شخص کے رُوپ میں دیکھتی ہو، جو اپنے اذیت سہنے، شہید بننے کے حق پر مُصر ہو، جو اپنی سزا کے ایک بھی لمحہ یا ذرہ سے محروم رہنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ تم مجھے ایک اور گاندھی سمجھتی ہو، جو دنیا کے سامنے ہندوستانی عوام کے دکھوں کا شاہد ہے۔۔۔“ گرامچی کو افعال کے عملی نتائج کا شدید احساس تھا اور وہ ہمیشہ ادھ کچرے اور نامکمل افعال سے بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ، گرامچی جیل کی زندگی کے دوران ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے دُکھ کو جھیلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا، جس سے بچنے کے لیے جیل کے قوانین میں جواز موجود تھا۔ جیل کے قوانین کے مطابق، اُسے لکھنے پڑھنے کا سامان اور کتابیں مانگنے کا حق تھا۔ اسے یہ بھی حق تھا کہ بیمار پڑنے پر وہ جیل کے طبی مرکز میں بھیجے جانے کی مانگ کرے، اپنے لیے الگ کوٹھری کا مطالبہ کرے یا دوبارہ مقدمہ چلائے جانے یا ضمانت پر رہا کیے جانے کا مطالبہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی گرامچی نے کبھی کوئی ایسا حق طلب نہیں کیا، جس کا وہ قانوناً مجاز نہیں تھا اور نہ کبھی اس نے کوئی ایسی رعایت ہی مانگی، جس سے اس کے کردار پر حرف آتا۔

گرامچی کا رویہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو گرامچی نے اپنے بھائی کارلو کے نام لکھا تھا:

”اس وقت میرے لکھنے لکھانے کے حق کو تسلیم کرانے کے سلسلے میں کارروائی چل رہی ہے۔ یہ کارروائی کامیاب ہونی چاہیے۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تاتیانہ پھر اس بارے میں افسانے گڑھ رہی ہے کہ صحت کے اسباب کے سہارے میری

قید کو کس طرح گھر میں قید میں بدلا جاسکتا ہے ۔ ۔ ۔ درحقیقت، ایسا ہوا تو یہ میرے لیے ایک ذاتی رعایت ہی ہوگی اور یہ رعایات صرف اس صورت میں ہی مل سکتی ہیں جب کہ میں سرکاری طور پر درخواست دوں، اور اس میں وجہ یہ بتاؤں کہ میں نے اپنے خیالات بدل لیے ہیں، میں اب اس بات، اُس بات کو تسلیم کرنے لگا ہوں ۔ ۔ تاتانیانہ کبھی ان باتوں کے بارے میں نہیں سوچتی۔ اس کی یہ انتہائی تیز فہمی بعض اوقات مجھے خوف زدہ کر دیتی ہے، کیونکہ کسی کے آگے کسی چیز کے لیے گھٹنے ٹیکنے یا اپنے برتاؤ میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اتنا صابر ضرور ہوں کہ اس رویّہ کے جو بھی نتائج نکلیں، میں سکونِ قلب سے اُن کا سامنا کرسکوں۔ کچھ عرصے سے میں جاننے لگا تھا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس حقیقت کے احساس نے ہی میری قوتِ ارادی کو مضبوط بنایا ہے۔ بات جب ایسی ہو تو تاتانیانہ کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایسے من گھڑت افسانوں کا تذکرہ تک کرنا غلط بات ہے، کیونکہ ان کے تذکرہ سے ہی کوئی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ میں ہی ان امکانات کے بارے میں سوچ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ "

خود تاتانیانہ کو گرامچی نے اس بارے میں کافی سخت اور کھرے انداز میں لکھا تھا: " ۔ ۔ ۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس قسم کے معاملات میں تم میری عزت اور میرے وقار کی اہمیت کو سمجھنے کے ناقابل قطعی طور پر ناقابل ہو؟ ۔ ۔ "

گرفتاری کے فوری بعد گرامچی کو اُستیکا نامی ایک جزیرے میں بھیج دیا گیا، جہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ اس چھوٹے سے جزیرہ کی آبادی ۱۶۰۰ نفوس پر مشتمل تھی، جن میں سے پانچ چھ سو غیر سیاسی قیدی تھے۔ گرامچی کو جن سیاسی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا اُن میں دو سوشلسٹ ممبران پارلیمنٹ اور تین کمیونسٹ شامل تھے۔ اُن میں آماڈیو بوردیگا بھی تھا جس کے نظریات کی گرامچی نے پارٹی میں جم کر مخالفت کی تھی، لیکن ان اختلافات کو بھلا کر قید کی زندگی میں کچھ نظم و ضبط لانے میں وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگے۔

مطالعہ کے لیے گرامچی کو کتابیں بھی میسر آگئیں۔ تورین میں طالب علمی کے زمانے میں گرامچی اور پیئرو زرافا کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے۔ یہی دوستانہ تعلقات اس آڑے وقت میں کام آئے۔ پیئرو زرافا نے، جو کالیاری یونیورسٹی میں معاشیات کا پروفیسر تھا، میلان کے ایک کتب فروش کے یہاں گرامچی کے نام سے ایک کھلا کھاتہ کھلوا دیا۔ اس طرح جو کتابیں گرامچی کو موصول ہوئیں، وہ اس اسکول میں بھی کام آئیں، جو استیکا کے سیاسی قیدیوں نے قائم کیا تھا۔ گرامچی استاد بھی تھا اور طالب علم بھی۔ وہ تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا تھا اور خود جرمنی سیکھتا تھا۔ سائنس پڑھانے کی ذمہ داری بوردیگا نے اُٹھا رکھی تھی۔ استیکا میں قید کی زندگی کا یہ رنگ ڈھنگ صرف ۴۴ دن تک ہی باقی رہا، کیونکہ ۱۴ جنوری ۱۹۲۷ء کو اُسے میلان کی سان ویتورے جیل میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کردیے گئے۔

گرامچی کو کڑاکے کی سردی میں یہ سفر پیدل طے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئیں اور ہتھ کڑیوں کے باوجود اُسے اپنا چھوٹا موٹا سامان اُٹھا کر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا۔ اس اذیت ناک سفر کے بعد سان ویتورے جیل اُسے جنت ہی معلوم ہوئی۔ جیل پہونچنے کے دو دن بعد، ایک مجسٹریٹ نے اُس سے ابتدائی پوچھ گچھ کی۔ گرامچی اپنے بارے میں فکرمند نہیں تھا، لیکن وہ اپنی ماں کی طرف سے ضرور فکرمند تھا۔ اس نے اپنی ماں کو خط لکھ کر اس فکر و تردد کو دور کرنے کی کوشش کی۔

" ضرورت قوتِ برداشت کی ہے اور خوش قسمتی مجھ میں یہ بدرجہ اتم موجود ہے، ٹنوں کے حساب سے گاڑیاں بھر کے کئی گھر بھر کے (تمھیں یاد ہوگا جب کارلو چھوٹا سا تھا اور کوئی مٹھائی اُسے خاص طور پر پسند آتی تھی تو وہ کہا کرتا تھا،

، مجھے یہ سوگھر بھر کے چاہیے! تو مجھ میں بھی اتنی ہی قوتِ برداشت ہے، سو گھر بھر کے، اس سے بھی زیادہ) مگر تمھیں بھی قوتِ برداشت کی ضرورت ہے۔ تمھارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری ذہنی حالت بالکل مختلف ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم بوڑھاپے کا احساس کر رہی ہو، مگر میرا یقین ہے کہ تم اب بھی مضبوط اور توانا ہو، اپنے بوڑھاپے کے باوجود اور ان تمام غموں اور آفات کے باوجود، جو تم نے جھیلی ہیں۔ ۔ ۔"

۲۰ر فروری کو گرامچی نے اپنی بہن تیریسینا کو ماں کی فکر و تشویش کو دور کرنے کے بارے میں لکھا۔ اس خط میں گرامچی نے اپنی ماں کی فکر و تشویش کے بارے میں یہ بھی لکھا:

" ۔ ۔ ۔ ہمارے درمیان احساس کی ایک پوری دُنیا اور ایک پورا طرزِ فکر کھائی کی مانند حائل ہے۔ جبکہ میرے لیے یہ اُس سیاسی جدّوجہد کا ایک وقوعہ ہے، جو جاری ہے اور جو نہ صرف اٹلی میں، بلکہ ساری دُنیا میں جاری رہے گی، اس کے لیے یہ ایک ناگفتہ بہ سانحہ ہے، جس کے پیچیدہ اسباب و اثرات اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ میں پکڑا گیا بالکل اس طرح جس طرح جنگ کے دوران کوئی قیدی پکڑ لیا جاتا ہے، جسے یہ علم ہوتا ہے کہ ایسی بات ہو سکتی تھی اور یہ بھی کہ اس سے بدتر بھی بات پیش آ سکتی تھی۔"

مئی میں تاتیانہ بھی میلان میں آکر رہنے لگی، تاکہ وہ اپنے بہنوئی کے قریب رہ سکے۔ لیکن اُسے بیماری نے آن دلوچا اور اسے ایک شفاخانہ میں داخل ہونا پڑا۔ خاندان کے افراد میں تاتیانہ ہی اس حالت میں تھی، جو بوقتِ ضرورت گرامچی کی مدد کر سکتی تھی۔ بھائیوں سے اس کا ناتہ ٹوٹ سا گیا تھا۔ ماریو سے اس کی آخری ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ مقامی فسطائی فیڈریشن سے ملوث رہنے کے بعد وہ کچھ الگ تھلگ تو ہو گیا تھا، مگر اب بھی وہ انھیں نظریات کے زیرِ اثر تھا۔ جس وقت تورین کے فسطائیوں نے اس کے بھائی گنّارو کو زدوکوب کیا تھا ٹھیک انھیں دنوں کمیونسٹوں نے ماریو پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے کے بعد وہ پارٹی سے الگ ہو گیا تھا اور اپنے بیوپار میں لگ گیا۔ ماریو ایک بار گرامچی سے ملنے جیل آیا بھی تو اُس نے گرامچی کی حالت کے بارے میں ایک ایسا خط گھر لکھ مارا جس سے گھر والے یہ سمجھ بیٹھے کہ گرامچی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ ماریو کی اس بے وقوفی پر گرامچی نہایت برافروختہ ہوا اور اس نے آئندہ ماریو سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے ناتے بھی ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ماسکو سے اس کی بیوی جولیا کا خط بھی کبھی کبھار آتا۔ تین چار مہینے میں جولیا کا خط آتا بھی تو وہ چند سطروں پر ہی مشتمل ہوتا۔ اپنی بہن کی اس بے اعتنائی کا کفارہ تاتیانہ بڑی شدّومد سے ادا کرنے کی کوشش کرتی۔ گرامچی کے دس سالہ دورِ اسیری میں تاتیانہ نے بے دریغ قربانیاں دیں اور ہر ممکن طریقہ سے گرامچی کے مصائب کو کم کرنے کی کوشاں رہی اور اس کے دُکھ کو بانٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

گرامچی مقدمہ شروع ہونے کا منتظر تھا۔ مقدمہ کا کیا نتیجہ نکلے گا، اس کے بارے میں وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسے سزا ہو گی اور کڑی سزا ہو گی، لیکن اس خیال نے بھی اُسے ہراساں نہ کیا:

"میری ہمت بلند ہے، لوگ کچھ بھی کہتے رہیں یا سمجھتے رہیں۔ شہید یا ہیرو بننے کی میری قطعی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں محض ایک اوسط آدمی ہوں، جس کے عقائد کی جڑیں کافی گہری تھیں اور جو کسی قیمت پر بھی انھیں ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ ۔ ۔"

ابتدائی تفتیش کافی وقت لے رہی تھی۔ پولیس کی رپورٹوں میں الزامات کی بھرمار تھی، مگر ثبوت اور شہادت کے معاملے میں پولیس کی یہ رپورٹیں تہی دامن تھیں۔ روم کی پولیس کی ایک رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ نومبر ۱۹۲۲ء میں

اس کے قبضے سے ہتھیار اور گولہ بارود برآمد ہوا تھا، جب کہ نومبر ۱۹۲۲ء میں گرامچی کو ماسکو پہنچے ہوئے چھ مہینے بیت چکے تھے اور وہ اس وقت ایک سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھا۔

اس تفتیش کے دوران، پولیس نے دو بار اپنے ایک جاسوس کے ذریعے گرامچی کے خلاف الزامات تراشنے کی ناکام کوشش کی۔ پولیس کے اس جاسوس نے ساتھی سیاسی قیدی کے بھیس میں گرامچی کی ہمدردی حاصل کرنے اور اُسے جکمہ دینے کی کوشش کی، مگر پولیس گرامچی کو اس جال میں پھانسنے میں ناکام رہی۔

گرامچی کی گرفتاری کا پہلا وارنٹ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۷ء کو جاری کیا گیا تھا۔ ۲۰ر مئی کو ایک نیا وارنٹ جاری کیا گیا، جس میں گرامچی پر خانہ جنگی کو ہوا دینے اور جائداد اور جانوں کے اتلاف کا الزام عائد کیا گیا۔ ۲ر جون سے اس نئے مقدمے کی ابتدائی تفتیش شروع ہوگئی۔ لیکن پولیس کے پاس اب بھی گرامچی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس بار پولیس نے ایک نیا حربہ آزمایا۔ گرامچی کو قیدِ تنہائی سے نکال کر دن میں دو دوسرے قیدیوں کے ساتھ میدان میں جسمانی کسرت کرنے کی اجازت دے دی۔ یہاں ایک قیدی میلانی نے گرامچی سے ربط بڑھانے کی کوشش کی۔ اس قیدی نے گرامچی کو بتایا کہ میلان کی فاشسٹ فیڈریشن کے سیکرٹری سے دشمنی کی وجہ سے اسے جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ اس قیدی نے دعویٰ کیا کہ اُس کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں، جن سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ میلان فاشسٹ فیڈریشن کا سیکرٹری قحبہ خانے اور رنڈی خانے چلاتا ہے۔ اس قیدی نے پیش کش کی کہ اگر گرامچی کمیونسٹ پارٹی سے اس کا مستقل ماہانہ مشاہرہ بندھوادے تو وہ یہ کاغذات گرامچی کے حوالے کرسکتا ہے، لیکن اس بار بھی گرامچی پھانسے میں نہ آیا اور پولیس نے اس بار بھی مُنہ کی کھائی۔

ثبوت فراہم کرنے میں پولیس کی ناکامی کے باوجود، مقدمہ میں مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ گرامچی کو اس خاص عدالت کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جو مسولینی نے مملکت کے تحفظ کے لیے قائم کی تھی، کیونکہ مسولینی کو عام عدلیہ نظام پر بھروسہ نہیں تھا، کیونکہ ابتدا میں عدلیہ نے فسطائیوں کے قبضہ کی تھوڑی بہت مزاحمت کی تھی۔

گرامچی کو اس خاص عدالت میں پیش کرنے کے لیے میلان سے روم پہنچا دیا گیا۔ مسلح پولیس کے سخت پہرے میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ۲۸ر مئی ۱۹۲۸ء کو اس عدالت کے سامنے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ صدرِ عدالت ایک جنرل تھا جبکہ جوری فاشسٹ ملیشیا کے پانچ کرنلوں پر مشتمل تھی۔ گرامچی کے علاوہ، ۲۱ دوسرے "ملزمین" عدالت میں موجود تھے۔ یہ سبھی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ ان سب نے کمیونسٹ پارٹی میں اپنی سرگرمیوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ۳۰ر مئی کو سب سے پہلے گرامچی سے سوالات کیے گئے۔

صدرِ عدالت: تم پر سازش کرنے، خانہ جنگی کو شہ دینے، مجرمانہ افعال کو برحق ٹھہرانے اور طبقاتی نفرت کو ہوا دینے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ تمھیں اپنے دفاع میں کیا کہنا ہے؟

گرامچی: میں پولیس کو دیے گئے اپنے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔ پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ میں کمیونسٹ ہوں اور میری سرگرمیاں بھی کسی سے مخفی نہیں رہیں۔ اور پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت اور لا یونیتا کے مضمون نگار کی حیثیت سے میں ان کی توضیح پیش کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا اور اگر میں چاہتا بھی تو میرے لیے یہ ناممکن ہوتا، کیونکہ کئی برسوں سے پولیس کے ایجنٹ ہر جگہ میرے پیچھے لگے رہے ہیں۔ گھر اور گھر کے باہر انھوں نے مجھ پر نظر رکھی ہے۔ چنانچہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا

گیا۔ بظاہر میری حفاظت کے لیے میری کڑی نگرانی کی گئی، جواب میرا سب سے مسکت دفاع بن گئی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ تورین کے ناظم اور پولیس کے چیف کو میرے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے بطور گواہ طلب کیا جائے۔ علاوہ ازیں کمیونسٹ ہونے کے ناتے مجھ پر جو بھی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انھیں میں قطعی طور پر تسلیم کرتا ہوں . . . "

گرامچی کے ایک ساتھی ملزم امبرٹو ریکو فیراری پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے، ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس نے ۱۹۱۲ء میں مزدوروں کی ایک ہڑتال کی رہنمائی کی تھی، جس کی پاداش میں اسے سزا بھگتنا پڑی تھی۔ جب صدرِ عدالت نے اس سزا کا ذکر کیا تو فیراری نے جواب دیا: "جنابِ صدر، اس مرحلہ پر میرے اعمال کی اوانتی کے ایڈیٹر نے نہایت تعریف و توصیف کی تھی اور وہی شخص اس وقت ہماری ریاست کا سربراہ ہے۔" ایک اور ملزم، ریبولدی ممبر پارلیمینٹ بھی تھا اور وکیل بھی، اور ایک وکیل کی حیثیت سے وہ سینکڑوں ایسے مقدموں میں وکیل صفائی کے طور پر پیش ہو چکا تھا جن میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو ملزموں کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ ریبولدی نے عدالت کے سوالات کے جواب میں کہا: "میں نے تین سو سے زائد کمیونسٹوں کی وکالت کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو ججوں نے بے گناہ قرار دے کر رہا کیا تھا۔ ان کا دفاع کرنے پر آج مجھے کیوں ملزم گردانا جا رہا ہے؟"

استغاثہ نے ۲ جون کو عدالت سے خطاب کیا۔ استغاثہ نے سبھی ملزمین پر الزامات کا ایک طومار سا باندھ دیا۔ گرامچی کا تذکرہ کرتے ہوئے استغاثہ کے وکیل نے کہا: "ہمیں بیس برس کے لیے اس ذہن کو کام کرنے سے روک دینا ہے۔"

امبرتو تراچینی نے، جو سیاسی بار یک بین ہونے کے ساتھ ساتھ قانونی باریک بین بھی تھا، اخیر میں سبھی ملزمین کی طرف سے عدالت سے خطاب کیا۔ اس خطاب نے صدرِ عدالت اور تراچینی کے درمیان ایک طویل سیاسی اور قانونی بحث کی صورت لے لی۔ لیکن یہ بحث بے سود تھی، کیونکہ فاشسٹ حکمراں ان ملزموں کو پہلے ہی سے مجرم ٹھیرا چکے تھے اور یہ نام نہاد مقدمہ محض ایک دکھاوا ہی تھا۔ امبرتو تراچینی نے اپنی بحث کے اخیر میں کہا: "طبقاتی نفرت کو انگیخت کرنے اور خانہ جنگی کو ہوا دینے کا ہمیں تھوڑی دیر بعد ہی مجرم اور سزاوار گردانا جانے والا ہے مگر تاریخ ان کڑی سزاؤں کی فہرست دیکھ کر، جو ہمیں سنائی جانے والی ہیں، اس کارروائی کو خانہ جنگی کا ایک وقوعہ ہی قرار دے گی . . . "

ایک طے شدہ امر کے طور پر سب ملزموں کو کڑی سزائیں سنا دی گئیں۔ گرامچی کو بیس سال چار مہینے اور پانچ دن کی سزا دی گئی۔ اتنی ہی سزا رویدا اور اسکاچی ماترو کو بھی دی گئی جبکہ تراچینی کو بائیس برس نو مہینے، پانچ دن کی سزا دی گئی۔ باقی ملزموں کو بھی اتنی ہی سخت سزائیں دی گئیں۔

۸ جون ۱۹۲۸ء کو تیرسینا نے مسولینی کو خط لکھا، جس میں اس نے گرامچی کا طبّی معائنہ کرانے اور خرابیٔ صحت کی بنا پر اسے جیل کے ہسپتال میں بھیجے جانے کی درخواست کی۔ گرامچی کا طبّی معائنہ ہوا۔ کچھ عرصہ قبل گرامچی کے بارہ دانت گر گئے تھے۔ اس کا منہ اور مسوڑھے ورم آلود تھے اور اس کے جسم میں زہر باد پھیل رہا تھا۔

گرامچی کو توری کے جیل خانہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بارہ دن کے سفر کے بعد ۱۹ جولائی کو گرامچی توری پہنچا:

"روم سے توری تک کا سفر ہولناک تھا۔ روم میں میں نے جو درد محسوس کیا تھا اور جسے میں نے معدہ کی معمولی شکایت سمجھا تھا، وہ نہایت تیز بخار کی شروعات ثابت ہوا۔ میں شدید ترین بیمار تھا۔ بینے ونتو میں میں نے دو جہنمی دن اور راتیں ایک کیڑے کی طرح تڑپتے گزاریں، اس طرح کہ میں نہ ساکت رہ سکتا تھا، کھڑا رہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی لیٹ سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا یہ بخار سینٹ انتھونی کی آگ ہے اور اسے فرو کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

تورن جیل میں پہنچتے ہی گرامچی کو فوراً سختیوں کا احساس ہو گیا۔ جیل کے منتظم بھی نہایت بے حس ثابت ہوئے۔ قیدیوں کی صحت کی دیکھ بھال ایک ڈاکٹر کرتا تھا۔ جس کا نام کِستر ِینو تھا۔ ایک ادیب ، دومنیکو زوکارو نے گرامچی کے حالات اور اس ڈاکٹر کی یہ تصویر کشی کی تھی :

"گرامچی کو طبی مدد کی سخت ضرورت ہے اور اس کے رہن سہن کو فوری طور پر بہتر بنایا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر کِستر ِینو اس پر کوئی توجہ نہیں کرتا ؛ بلکہ ایک دن اس نے اسے (گرامچی) کو بتایا کہ اچھے فاشسٹ کے طور پر وہ اُسے مُردہ دیکھنا ہی پسند کرے گا . . . "

دو برس چار مہینے قید میں بتانے کے بعد آخر فروری ۱۹۲۹ء کے اوائل میں گرامچی کو اپنی کوٹھری میں لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی اور ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا سامان بھی مل گیا۔ گرفتاری کے چار مہینے بعد ہی گرامچی نے جولیا کے نام ایک خط میں اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا تھا کہ وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایسے موضوعات پر گہرائی اور نظم و ضبط کے ساتھ لکھنا چاہتا ہے ، جو اس کی پوری توجہ کو جذب کر سکیں اور اس کی باطنی زندگی کو مرتکز کر سکیں اور اسے سمت دے سکیں۔ اس وقت چار موضوعات اس کے ذہن میں تھے ، جن پر وہ اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا :

۱ - اطالوی عبقریوں (Intellectuals) کی تاریخ ، ان کے مختلف ماخذ ، ثقافتی رجحانات کے تعلق سے ان کی متنوع گروہ بندیاں اور ان کے مختلف النوع انداز ہائے فکر (۲) تقابلی لسانیات کا مطالعہ (۳) پیران دیلو کے تھیٹر اور اس کے ذریعہ اطالوی تماشائی theatrical ذوق میں تبدیلی کا مطالعہ ، جس کا ترجمان پیران دیلو تھا اور جسے وضع کرنے میں اس نے اعانت کی تھی۔ (۴) سلسلہ وار شائع ہونے والے ناولوں اور ادب کے بارے میں عامیانہ ذوق پر ایک مضمون۔

لیکن کاغذ قلم ملتے ہی گرامچی ان موضوعات پر متوجہ نہیں ہوا ، بلکہ اس نے پہلے جرمن سے کچھ تراجم کیے : "فی الحال مَیں ترجمہ کر رہا ہوں ، ہاتھ کو سدھانے کے لیے اور اس دوران میں اپنے خیالات میں کچھ نظم لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" گرامچی نے جن حالات میں اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا ، انھیں حوصلہ افزا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اپنے منتخب کردہ موضوعات پر لکھنے کے لیے اُسے کتابوں اور دستاویزات کی ضرورت پیش آتی تھی ، جو اُسے جیل میں میسر نہیں ہوتی تھیں۔ اسے باہر سے جو کتابیں ملتی تھیں ، ان میں باقاعدگی سے زیادہ بے قاعدگی ہی تھی۔

گرامچی کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ غور و فکر میں ڈوبا اپنی کوٹھری میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ جب اس کے ذہن میں وہ بات صاف ہو جاتی ، جو وہ لکھنا چاہتا تھا تو وہ اپنی لکھنے کی میز پر جاتا ، ایک چھوٹے اسٹول پر گھٹنا ٹیک کر اسے ضبطِ تحریر میں لے آتا۔ لکھنے کے بعد وہ سیدھا ہوتا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ روزناموں کی صحافت کا تجربہ ہونے کے باوجود گرامچی کبھی آسانی یا روانی سے لکھنے کا عادی نہیں ہو سکا۔ لیکن گرامچی غور و فکر کے ہر وقفہ کے بعد جو کچھ لکھتا تھا ، اس میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں کرتا تھا۔

گرامچی کے لیے روزانہ دو تین گھنٹے لکھنا معمول بن گیا۔ جیل کے نامساعد حالات ، تیزی سے رُو بہ انحطاط صحت اور جولیا کی طویل خاموشیوں کے وقفوں سے لاحق ہونے والی ذہنی کوفت کے باوجود گرامچی روزانہ ـــــــ مہینے در مہینے سال در سال ـــــــ لکھتا رہا۔ اس طریقے سے گرامچی نے اپنی انقلابی جدّ و جہد کو جاری رکھا اور دنیا سے ، انسانی سماج سے اپنے ربط کو باقی رکھا۔

گرامچی نے اخیر میں ۳۲ نوٹ بکس چھوڑیں، جن میں ۱۲ نوٹ بکس اس نے توری میں پُر کرلی تھیں یا جن میں اُس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نوٹ بکس ۲۸۴۸ صفحات پر مشتمل تھیں یہ صفحات تخمیناً . . . ۴۰۰۰ ٹائپ شدہ صفحات کے برابر تھے۔ ان نوٹ بکس کا مطالعہ کرنے پر ان کے بارے میں پہلا تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ موضوعات ایک دوسرے سے گہرا ارتباط رکھنے کے باوجود مکمل اور بھرپور طور پر نہیں اُبھر سکے۔ اکثر مقامات پر گرامچی نے مختصر نوٹس ہی رقم کیے تھے۔ بعض جگہ سالوں بعد گرامچی نے ان نوٹس کو کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ ان نوٹ بکس کے حاشیوں میں اُن مضامین کا ماحصل بھی اختصار کے ساتھ درج کیا ہے، جو اُس کے زیرِ مطالعہ آتے تھے یا جو اُس کے ذہن میں تازہ ہوجاتے تھے۔ دوسرے مرحلہ پر یہ نوٹس کچھ ٹھوس صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ صرف چند موضوعات ہی ایسے تھے، جن میں مسودہ اپنی آخری صورت میں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نوٹ بکس نوٹ بکس ہی ہیں، جنہیں تکمیل شدہ مسودات کی صورت نہیں دی جاسکی۔

ان بکھرے ہوئے اور غیر اتمام شدہ نوٹس میں بھی ایک مرکزی خیال مشترکہ کڑی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ مرکزی خیال پہلے پہل گرامچی نے غیر مکمل صورت میں جنوبی اطالیہ کے مسئلہ پر اپنے مضمون میں پیش کیا تھا۔ اس مضمون میں گرامچی نے طبقاتی اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی۔ گرامچی کا یقین تھا، پرولتاریہ صرف اس حد تک کامیابی سے ہمکنار ہوسکتا ہے اور اپنے نئے نظام کے استحکام کو مضبوط بنا سکتا ہے جس حد تک وہ استحصال و لوٹ کھسوٹ کے شکار دوسرے طبقات کو اپنے کاز کا ہمنوا و حامی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ گرامچی اس ضمن میں پرولتاریہ اور کسان طبقہ کے اتحاد کو خاص اہمیت دیتا تھا، مگر گرامچی کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ کسان طبقہ حکمران اور بورژوا طبقہ کے نظریہ کائنات و حیات کا تابع و پابند ہے۔ اس نظریہ کائنات و حیات کو حکمراں طبقے کے دانش ور صیقل کرتے رہتے ہیں۔ گرامچی کا خیال تھا کہ کسان طبقہ کو زمیندار طبقہ سے الگ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دانش وروں کا ایک ایسا نیا گروہ سامنے آئے، جو بورژوا نظریہ کائنات و حیات کو رد کرتا ہو۔

اپنی نوٹ بکس میں گرامچی نے اطالوی سماج میں دانش وروں و عبقریوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ اور اُن فلسفوں کا بھی جائزہ لیا تھا جو بورژوا اقتدار کی بنیاد بنتے ہیں۔ گرامچی نے پرولتاریہ کے نئے نظریہ کائنات و حیات پر بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ گرامچی کا نظریہ یہ تھا کہ بورژوا نظام کی اصل طاقت حکمراں طبقہ کے تشدد یا ریاستی آلات جبر میں مضمر نہیں ہوتی، بلکہ حکمراں طبقہ کے اس نظریہ کائنات و حیات میں مضمر ہوتی ہے، جسے محکوم طبقے قبول کرلیتے ہیں۔ حکمراں طبقہ کے فلسفۂ حیات کو 'عمومی عقل' کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے، یعنی یہ فلسفۂ حیات عوام کا فلسفۂ حیات بن جاتا ہے اور وہ اس معاشرہ کی اخلاقیات، رسوم و رواج اور برتاؤ کے سکہ بند ڈھانچوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ گرامچی نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ حکمراں طبقہ کس طرح اور کیسے محکوم طبقات کی تسلیم و رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے؛ ساتھ ہی گرامچی نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ محکوم طبقات کس طرح اور کیسے پرانے نظام کو ختم کرنے اور اس کی جگہ عام آزادی کا ایک نیا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

گرامچی نے نوٹ بکس میں ۱۹ ویں صدی میں اطالوی بازخیزی کے دور میں عوام کے محدود و ثانوی کردار کے اسباب کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس دور بازخیزی نے ایک ایسی 'شاہی فتح و کامرانی' کا روپ اس لیے لیا تھا کیونکہ اس وقت عوام میں قومی شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کی ثقافت اور ادب بھی قومی - عوامی شعور، سے محروم تھے اور دانش ور و عبقری قومیت سے مبرا دو عظیم اداروں، چرچ اور سلطنت کی ہی ضروریات کی آئینہ داری کرتے تھے۔ اطالوی تاریخ کے اسی دور میں، جب اوپر سے لادا ہوا قومی اتحاد وجود میں آچکا تھا، بینے دیتو کروچے کے بورژوا ڈیموکریٹک نظریہ کائنات نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

گرامچی نے کروچے کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور مارکسزم اور کروچے کے نظریات کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد کچھ دُور رس نتائج اخذ کیے ہیں۔ گرامچی نے یہ تقابلی جائزہ اپنے اس یقین کی روشنی میں لیا ہے کہ نیا پرولتاری نظریۂ کائنات اوّلین طور پر محکوم طبقات کے ذہن میں پیوست و جذب ہونا چاہیے۔ اس نئے پرولتاری نظریۂ کائنات سے لیس ہونے کے بعد ہی محکوم طبقات ریاست کے حکمراں طبقہ کے نظریۂ کائنات کے سہارے حکومت کرنے کے حق کو چیلنج کر سکتے ہیں اور امکانی طور پر حکمراں طبقے کی ریاست کی جگہ محکوم طبقوں کی ریاست کا قیام عمل میں لاسکتے ہیں اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد امکانی حد تک وسیع ترین تائید و حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ پرولتاریہ کو ایک ساتھ غالب طبقہ اور حکمراں طبقہ کا کردار ادا کرنا ہوگا سرمایہ دارانہ گروہوں کو زیر کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے اسے غالب طبقہ بننا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اُسے معاشرہ کو اخلاقی اور دانشورانہ سمت دینے کے لیے حکمرانی کرنی ہوگی، تاکہ ان سب گروہوں کو سوشلزم کا ہمنوا و حامی بنایا جائے، جو کسی نہ کسی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہیں: گرامچی لکھتا ہے: "ریاستی اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے ایک سماجی گروہ کی حکمرانی و فرمانروائی قائم ہو سکتی ہے اور قائم ہونا ضروری ہے (اقتدار پر قبضہ کے لیے اپنے آپ میں یہ ایک بنیادی شرط ہے)؛ بعد میں یہ گروہ اقتدار کو استعمال کرنے کے دوران غالب گروہ بھی بن جاتا ہے، لیکن اُسے حکمراں و فرماں روا بنے رہنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔"

گرامچی کا یقین تھا کہ روسی انقلابی تجربہ کا مغرب میں کہیں بھی اعادہ نہیں ہو سکے گا۔ روس میں کھلم کھلا محاذ آرائی کے بعد تیز اور فیصلہ کن حملہ کرنا ممکن تھا، کیونکہ مہذب سماج ابتدائی اور لجلجی شکل میں تھا اور اس کے علاوہ، زار شاہی ریاست اپنے محکومین کی رضامندی پر مبنی نہیں تھی۔ جبکہ مغرب کے بورژوا طبقہ کے عبقری اور اخلاقی حکمرانی کے ذریعہ لبرل ریاستی نظام کے حق میں اپنے شہریوں کی عظیم اکثریت کی رضامندی حاصل کرلی ہے، جس کی وجہ سے مغرب میں ریاست محض ایک ہراول خندق ہے، دفاع کی اوّلین صف ہے اور اس کے پیچھے کنکریٹ کے چھوٹے چھوٹے مورچوں پر مشتمل ایک زبردست قلعہ ایستادہ ہے یہ قلعہ لوگوں کا طرزِ زندگی، طرزِ فکر، اُمیدوں، اخلاقی اصولوں اور عادات پر مشتمل ہے، جو اکثر لوگوں نے بورژوا حکمراں طبقہ نظریۂ حیات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے عمل کے دوران اپنے اندر جذب کیے ہیں؛ اور یہ خصوصیت ہی فوری معاشی اسباب و بحرانات (کساد بازاری وغیرہ) کے زیر اثر، مہذب معاشرہ کو زیر و زبر کر دینے والے ابال سے محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ مغرب کی بورژوا جمہوری ریاستوں میں کھلم کھلا محاذ آرائی کے بجائے مقامات کے لیے جنگ لڑنی چاہیے اور بولشویک حکمتِ عملی کی جگہ ایک ایسی حکمتِ عملی اپنانی چاہیے، جس کا سیدھا سادا مقصد ریاستی اقتدار (ہراول خندق) پر قبضہ کرنا نہ ہو، بلکہ جس کا مقصد اس زبردست قلعہ پر قبضہ کرنا ہو، جو کنکریٹ کے چھوٹے چھوٹے مورچوں پر مشتمل ہے۔ گرامچی اپنی نوٹ بک میں آگے لکھتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ ایلیچ (لینن) نے سمجھ لیا تھا کہ کھلم کھلا محاذ آرائی کو، جو مشرق میں کامیاب ہوئی تھی، بدل کر مقامات کی جنگ کی حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ صرف یہی حکمتِ عملی مغرب میں سمجھ میں بھی آتی ہے۔ مگر اسے اس نظریہ کو فروغ دینے کے لیے درکار وقت میسر نہیں آسکا اور بہر کیف وہ صرف نظری طور پر ہی ایسا کر سکتا تھا، کیونکہ بنیادی طور پر یہ فریضہ ایک قومی فریضہ ہے یعنی اس کے لیے مختلف معاشروں کی صورتِ حال کا جائزہ لینا اور اُن کے سبھی عناصر کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔"

اپنی نوٹ بکس میں گرامچی نے اسی ٹھوس صورتِ حال اطالیہ کی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور اطالوی معاشرہ کے مختلف عناصر کا تجزیہ اور ان کی نشاندہی کی ہے۔ گرامچی بار بار اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہے کہ مقامات (positions)

کی اس جنگ کے لیے پرولتاری فوج کو ایک نئے نظریۂ کائنات، نئی طرزِ زندگی، نئی طرزِ فکر، نئی اخلاقیات، نئے افکار سے لیس ہونا چاہیے اور اس کے بعد ہی بورژوا نظریۂ کائنات کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے۔

اقتدار پر قبضہ کے بعد، اقتدار کے استعمال کا مرحلہ آتا ہے۔ گرامچی لینن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ غلبہ (جبر) اقتدار کی صرف ایک صورت ہے، جو تاریخ کے ایک مرحلہ پر ضروری ہوتا ہے؛ عبقری اور اخلاقی فرمانروائی ہی اقتدار کی وہ صورت ہے جو استحکام کی ضمانت ہے، کیونکہ عبقری اور اخلاقی فرماں روائی عوام کے وسیع ترین حلقوں کی رضا کے ذریعہ استحکام کی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔

محنت کش طبقہ کے "اجتماعی عبقری" کا فریضہ انقلابی سیاسی پارٹی ادا کرتی ہے، جسے گرامچی نے جدید شہزادہ بھی کہا ہے:

"شہزادۂ جدید یا دیو مالائی شہزادہ ایک حقیقی انسان، ایک فرد نہیں ہو سکتا (جیسا کہ ماکیاویلی نے اپنے اسی نام کے مشہور مقالہ میں اُمید باندھی تھی) وہ ایک اجتماعی تنظیم ہی ہو سکتی ہے؛ ایک مرکب سماجی ادارہ، جس میں اجتماعی ارادہ، اپنے وجود کا احساس کرنے اور عمل کے دوران، اپنے وجود کا شعور حاصل کرنے کے بعد، صورت پذیر ہونے لگا ہو۔ تاریخ ایسی اجتماعی تنظیم کو سیاسی پارٹی کے روپ میں جنم بھی دے چکی ہے۔ ایک ایسا بنیادی خلیہ جس میں اجتماعی ارادہ کے بیج جمع ہوں گے اور عالمگیر اور کلی شکل اختیار کرنے کے کوشاں ہوں گے . . . شہزادۂ جدید کو عبقری اور اخلاقی اصلاح کا نقیب اور ناظم ہونا چاہیے اور اسے یہ ہونا ہی پڑتا ہے ——— یعنی وہ اعلیٰ تر اور ہمہ پہلو تہذیب کی مزید ترقی و فروغ کی سمت میں اجتماعی، قومی۔عوامی ارادہ کے لیے لائحۂ عمل پیش کرتا ہے۔ اجتماعی، قومی۔عوامی ارادہ (جس کا شہزادۂ جدید مظہر بھی ہے اور خالق بھی) اور عبقری اور اخلاقی اصلاح، وہ دو بنیادی نکتے ہیں، جن پر (پارٹی کے) کام کا ڈھانچہ مبنی ہونا چاہیے۔"

گرامچی نے بنیادی طور پر نوٹ بکس میں انہی دو بنیادی نکتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور اس نے اٹلی کے ٹھوس حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ نہایت باریک بینی کے ساتھ، عبقری اور اخلاقی اصلاح کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ گرامچی نے اس اصلاح کے بعض مسائل کی طرف محض اشارہ ہی کیا ہے، کیونکہ جیل کے حالات نے اُسے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کی کبھی اجازت نہیں، جبکہ اس کے کام کرنے کی اہلیت، دگرگوں صحت کے باوجود محض اس کی زبردست قوتِ ارادی کی رہینِ منت تھی۔ اس وقت جولیا کی طویل سے طویل تر ہوتی ہوئی خاموشی کی وجہ سے گرامچی سخت ترین ذہنی اذیت میں مبتلا رہتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۹ اور جولائی ۱۹۳۰ء کے دوران ایک برس میں اُسے جولیا کا ایک ہی خط ملا تھا۔

جولیا کی اس سرد مہری کے برعکس، تاتیانہ اپنے بہنوئی کی دلجوئی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ وہ روم سے لوٹ آئی اور عرصہ تک وہاں مقیم رہی۔ وہ کسی نہ کسی طرح گرامچی کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ اسے دلاسا دیتی اور جولیا کی خاموشی کے بارے میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراشنے کی کوشش کرتی۔ جیل میں تاتیانہ سے مختصر ملاقاتوں کے دوران اور جیل سے تاتیانہ کے نام لکھے گئے خطوط میں گرامچی اپنے جلے ذہن اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا تھا۔

گرامچی نے تاتیانہ کے نام اپنے ایک خط میں اپنے اور جولیا کے تعلقات کو اسکینڈے نیویا کی اس لوک کتھا سے واضح کیا تھا: "ایک دفعہ کا ذکر ہے اسکینڈے نیویا میں تین دور دراز پہاڑوں کی تین چوٹیوں پر تین دیو رہتے تھے۔ ہزاروں سال کی خاموشی کے بعد پہلے دیو نے باقی دو سے بلند آواز میں کہا، "مجھے مویشیوں کے ریوڑ کے ڈکرانے کی آواز سنائی دے رہی ہے!" تین سو برس بعد دوسرے دیو نے جواب دیا: "سنائی تو مجھے دے رہی ہے!" اور تین سو برس کے بعد تیسرے دیو نے

باقی دوسے کہا، ”اگر تم یہ شور شرابہ بند نہیں کرتے تو میں چلا!“

اگست اور ستمبر ۱۹۳۰ء میں گرامچی کو جولیا کے دو خط ملے، لیکن ان کا لب ولہجہ نہایت خشک اور اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ان خطوط نے گرامچی کی ذہنی کوفت میں اضافہ ہی کیا۔ گرامچی کے ذہن کو ایک اہم سیاسی وقوعہ نے بھی پراگندہ بنایا۔ کمنترن نے اپنی چھٹی کانگریس اور جولائی ۱۹۲۹ء میں اپنی ایگزیکٹو کمیٹی کے دسویں اجلاس میں ایک نئی سیاسی لائن اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کمنترن کی اس نئی سیاسی لائن کے خدوخال یہ تھے: سرمایہ دار ریاستیں تباہی کے دہانے پر کھڑی لڑکھڑا رہی ہیں، جبکہ محنت کش طبقہ کا انقلابی شعور بیدار ہو رہا ہے۔ پرولتاریہ کو بورژوا ڈیموکریٹک پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنانے کے بجائے اپنے بل بوتے پر بورژوا اور فاشسٹ ریاستوں کا خاتمہ کر کے ان کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنی چاہیے۔ جبکہ گرامچی کا یہ یقین تھا کہ امکانی طور پر فاشزم کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ لے سکتی ہے، لیکن اس امکان کو یقینی نہیں سمجھا جاسکتا ——— یقینی امکان یہی ہے کہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کے قیام سے پہلے پرولتاریہ کو فاشزم کا تختہ پلٹنے کی مہم میں جمہوری حلقوں کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔

کمنترن کی اس نئی سیاسی لائن کے نتیجہ میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور متحدہ محاذ کے حامیوں کو ابن الوقتی کا مجرم قرار دے کر پارٹی سے خارج کیا جانے لگا۔ اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے ماہانہ رسالے State Operats میں، جو پیرس سے شایع ہو رہا تھا، متحدہ محاذ کے حامیوں کے خلاف توگلیاتی کے مضامین شایع ہو رہے تھے۔

اس وقت گناروگرامچی بھی پیرس میں ہی تھا۔ توگلیاتی نے اس سے رابطہ قایم کیا اور اسے نئی لائن کے بارے میں انتونیو گرامچی کے خیالات جاننے کی ہدایت کی، کیونکہ گنارو اب بھی قانونی طور پر اٹلی میں داخل ہو سکتا تھا اور انتونیو سے توری جیل میں ملاقات کر سکتا تھا۔

چنانچہ گنارو جون ۱۹۳۰ء کے دوسرے ہفتے میں اٹلی میں داخل ہوا اور انتونیو سے ملنے کے لیے توری جیل پہنچا۔ ایک ہمدرد وارڈر کی موجودگی نے، جو ان دونوں بھائیوں کے گاؤں کے قریب کا ہی رہنے والا تھا، دونوں کو کھل کر گفتگو کرنے کا موقع دے دیا۔ پارٹی اور کمنترن کی نئی لائن کے بارے میں سن کر گرامچی دم بخود رہ گیا۔ گرامچی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پارٹی متحدہ محاذ کے حامیوں کے پارٹی سے اخراج کے معاملے میں جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

اس مختصر ملاقات اور نئی لائن کے بارے میں انتونیو کے خیالات جاننے کے بعد گنارو اپنے گاؤں گلرزا چلا گیا۔ مہینہ کے اواخر میں پیرس جانے سے پہلے گنارو پھر انتونیو سے ملنے کیلیے جیل پہنچا، لیکن اس بار خفیہ پولیس اس کی سخت نگرانی کر رہی تھی، جس کے باعث یہ دونوں بھائی کسی سیاسی مسئلہ کو نہیں چھیڑ سکے اور انھوں نے اپنی بات چیت گھریلو معاملات تک محدود رکھا۔

لیکن گنارو نے پیرس واپس پہنچ کر پارٹی کو نئی لائن کے بارے میں گرامچی کی اصل پوزیشن سے مطلع نہیں کیا۔ گنارو نے توگلیاتی کو یہی بتایا کہ انتونیو پارٹی کی نئی لائن سے قطعی متفق ہے۔ گنارو نے جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر پارٹی کو انتونیو کی اصل پوزیشن بتادی گئی تو پارٹی اسے بھی موقع پرست قرار دے کر پارٹی سے خارج کرنے میں ہچکچائے گی نہیں۔

پارٹی لائن میں اس تبدیلی کی خبر نے گرامچی کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا۔ گرامچی نے ایک بار پھر مسائل اور واقعات کا اپنے ذہن میں تجزیہ کیا اور اس بار بھی وہ اسی نتیجہ پر پہنچا، جس نتیجہ پر وہ پارٹی لائن میں تبدیلی سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ گرامچی کو اس پر

سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوتی تھی کہ خود کو کمیونسٹ کہنے اور سمجھنے والے اس کے ساتھی معروضی طور پر صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بجائے محض خالی خولی انقلابی لفاظی پر اکتفا کرتے تھے اور اسی لفاظی کو عمل کا نعم البدل سمجھ کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ گرامچی کے یہ ساتھی انقلابی لفاظی کی رَو میں یہ پیش گوئی بھی کرتے تھے کہ "فاشزم بس دو تین مہینے کا ہی مہمان ہے . . . موسم سرما تک یقیناً فاشزم کا جنازہ نکل جائے گا اور اس کے فوری بعد ہی فاشسٹ ڈکٹیٹر شپ کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے گی۔"

گرامچی اپنے ساتھیوں سے اس وقت ان مسائل پر گفتگو کرتا تھا جب روزانہ مقررہ وقت پر انھیں جیل کے صحن میں ٹہلنے کے لیے کوٹھریوں سے باہر نکالا جاتا تھا۔ یہ گفتگو کبھی کبھی تلخ بحث کا رنگ لے لیتی، کیونکہ وہ ان تصورات کو غیر مارکسی میکانیکی اور ماورائی تصورات قرار دیتا۔ یہ سبھی تصورات اس ایک تصور پر قائم تھے کہ معاشی 'بدحالی' عوام کو پرولتاری انقلاب کی راہ پر لانے کا واحد سبب بنے گی۔ جبکہ گرامچی نہایت شدومد سے یہ کہا کرتا تھا کہ بدحالی اور بھوک کی وجہ سے بغاوتیں پھوٹ سکتی ہیں، ایسی ابتری پھیل سکتی ہے، جو سماجی نظام کی چولیں ہلا ڈالے، لیکن اس سے وہ شرائط پوری نہیں ہوتیں، جو سرمایہ دار کا قلع قمع کرنے اور اس کی جگہ پرولتاری حکومت کے قیام کو ممکن بنا سکیں۔

گرامچی اور اس کے جیل کے ساتھیوں کے موقف میں اس تفاوت و اختلاف کا نتیجہ قطع کلام اور ایک دوسرے پر شک کی صورت میں نکلا۔ قطع کلام ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ گرامچی کے ساتھی جیل وارڈروں سے نہایت اشتعال انگیز طریقے سے پیش آتے تھے، جبکہ گرامچی ان کے اس برتاؤ کو غلط سمجھتا تھا۔ گرامچی اپنے ساتھیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ جیل کی سختیوں کے لیے جیل وارڈر ذمہ دار نہیں تھے۔ اس پر گرامچی کے ساتھیوں نے اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ قانون کا احترام کرنے پر اس لیے زور دیتا ہے کہ وہ لکھنے اور باہر سے کتابیں منگانے کی سہولیات سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ اختلاف رائے، غلط فہمی اور قطع کلامی کا یہ نتیجہ نکلا کہ گرامچی سب سے الگ تھلگ ہو گیا۔

جیل سے باہر کی دنیا سے گرامچی کا تعلق اور رابطہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ جولیا کے خط بھی اکا دکا ہی آتے تھے۔ گھر سے بھی کبھی کبھار ہی کوئی خط آتا تھا۔ صرف تاتیانہ باہر کی دنیا سے گرامچی کے ربط و تعلق کا بھروسے قابل ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ تاتیانہ کے ذریعہ گرامچی کو یہ سن گن ملی کہ جولیا اعصابی مرض کی شکار تھی اور ہسپتال میں زیر علاج تھی۔ گرامچی کو جولیا کے خاموشیوں کے طویل وقفوں کی وجہ بھی ایک حد تک سمجھ میں آئی۔ گرامچی نے جولیا کو ایک طویل خط لکھا اور ٹوٹتے ہوئے تعلق کو استوار کرنے کی کوشش کی۔ جولیا کا جواب آیا۔ اس بار اس کے خط میں احساس کی گرمی تھی۔ مگر جلد ہی احساس کی یہ گرمی بھی ختم ہو گئی اور خطوط کے درمیان پھر لمبا وقفہ حائل ہونے لگا۔

گلرزا سے بھی بھولے بھٹکے کوئی خط آ جاتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ہی گرامچی ماریو سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ گنارو سے آخری ملاقات کے بعد گرامچی کو اس کا ایک ہی خط مل پایا تھا۔ اور وہ بھی سنسر کی سیاہی کا شکار ہونے کے بعد۔ کارلو نے گلرزا میں جوتوں کی دوکان کھولی تھی، مگر یہ دوکان چل نہیں سکی تھی۔ اس نے ایک ڈیری میں نوکری کر لی تھی، مگر یہاں بھی چھٹنی کی زد میں آنے کے بعد وہ بے کار تھا۔ کارلو ستمبر/اکتوبر ۱۹۳۰ میں گرامچی سے ملنے توری جیل آیا تھا، لیکن واپس پہنچنے کے بعد اس نے کوئی خط نہیں بھیجا تھا۔ اس کا خط نہ ملنے پر گرامچی کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں وہ بھی پولیس کے نظر کرم کا شکار نہ ہو گیا ہو۔

کبھی کبھی وہ اپنی ماں کو شکایتی لہجہ میں لکھتا:

"تم اتنے عرصہ تک مجھے خیر خیریت سے کیوں محروم رکھتی ہو؟ . . . لوگ جیل میں بند شخص کو اس لیے خط نہیں لکھتے کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتے یا پھر ان کی قوتِ تخئیل کمزور ہوتی ہے۔ تمھارے اور گھر کے دوسرے افراد کے بارے میں میں یقین نہیں کرسکتا کہ تمھیں میری پروا نہیں ہے۔ اس کی وجہ قوتِ تخئیل کی کمی ہی ہوسکتی ہے؛ جیل کی زندگی کیسی ہوتی ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ اور اس کا بھی کہ خطوط کتنی اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں، دن کے خلا کو وہ کس طرح پُر کرتے ہیں اور وجود کو کس طرح کچھ رنگ، کچھ معنی دیتے ہیں۔ میں یہاں کی زندگی کے منفی پہلو کے بارے میں زیادہ اس لیے نہیں لکھتا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھ پر رحم کھایا جائے۔ میں ایک سپاہی تھا جسے لڑائی کے دوران ایک مرحلہ پر بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا اور لڑنے والے جب شعوری فیصلہ کے بعد لڑیں تو ان پر رحم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان پر رحم کھانا چاہیے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منفی پہلو کا کوئی وجود ہی نہیں ہے یا جو مجھے عزیز ہیں، وہ کم سے کم اسے بدتر نہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔"

یہ شکایت دراصل اسے اپنی بہنوں، تیریسینا اور گریزیتا سے تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ خط لکھ سکے۔ ایک بار اس کی ماں نے تیریسینا کو بول کر خط لکھوایا۔ اس خط نے گرامچی کے دل و ذہن کو نہایت متاثر کیا اور اس خط نے ماں کے تعلق سے ان تمام یادوں کو تر و تازہ کر دیا، جو گرامچی کے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ تھیں۔ اس نے ماں کو لکھا:

"تیریسینا سے لکھوایا ہوا مجھے تمھارا خط ملا میرا خیال ہے کہ تم اس طرح ہی خط لکھوا کر بھیجا کرو۔ مجھے اس خط میں تمھاری پوری روح اور طرزِ فکر سمایا ہوا محسوس ہوا ——— یہ خط تمھارا ہی تھا، تیریسینا کا نہیں۔ تمھارے اس خط نے میرے ذہن میں کیسی کیسی یادیں تازہ کی ہیں . . . تم اندازہ ہی نہیں کرسکتیں کہ ایسے کتنے مناظر میرے ذہن میں تازہ ہو گئے جن میں تم ایک شفیق اور ہر طرح سے مدد کرنے والی ہستی کے روپ میں اُبھرتی ہو اگر تم سوچو تو روح اور روح کے لافانی ہونے یا جنّت یا جہنم کے تمام مسائل اس ایک سیدھی سادی حقیقت کو دیکھنے کے مختلف طریقے ہی ہیں: یہ حقیقت کہ ہمارا ہر ایک فعل اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے خود ہماری نیکی اور بدی کے لحاظ سے، دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ باپ بیٹے کو، ایک نسل دوسری نسل کو ایک لامتناہی سلسلے کے رُوپ میں یونہی متاثر کرتی ہے۔ اور چونکہ ہماری تم سے وابستہ سبھی یادیں نیکی اور استقامت سے بھرپور یادیں ہیں اور ان قربانیوں کی یادیں ہیں، جو تم نے ہمیں پرورش کرنے کی غرض سے دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو ہمیں جنّت میں پہنچ گئیں۔ ایک ماں کے لیے حقیقی جنّت، میرے خیال میں خود اس کے بچّوں کے دلوں میں ہی ہوسکتی ہے۔ دیکھا، میں نے تمھیں کیا لکھ مارا ہے؟"

گلرزا سے کبھی کبھی آنے والے خطوں کے ساتھ گرامچی کے بھتیجوں اور بھانجے بھانجیوں وغیرہ کے فوٹو بھی آجاتے تھے۔ خالی اوقات میں گرامچی ان فوٹوؤں کو بغور دیکھتا رہتا تھا، اور ان کے خد و خال میں مماثلتیں تلاش کرتا تھا۔

صحت اس کی خراب ہی تھی اور راتوں کو اسے بہت کم نیند آتی تھی۔ رات کو بمشکل دو ڈھائی گھنٹے کے لیے ہی اس کی آنکھ لگتی تھی۔

۲۷ر جولائی ۱۹۳۱ء کو گرامچی نے تاتیانہ کو لکھا:

"پچھلے کئی مہینوں سے میں گھنگھور نسیان کا شکار ہوں۔ مجھے اس سر درد کی تو شکایت نہیں ہوئی، جنھوں نے ماضی میں میرا ناطقہ بند کر رکھا تھا (میں انھیں 'مکمّل' سر درد کہتا ہوں) مگر اس کے بدلے مجھ پر بظاہر مستقل ایسی حالت طاری ہے، جسے میں دماغی قوتوں کا کافور ہوجانا ہی کہہ سکتا ہوں: عام نقاہت، بے حسی، کسی نقطہ پر

توجہ مرکوز کرنے کی نا اہلیت، یادداشت کی گمشدگی وغیرہ ۔ ۔ ۔"

یہ خط لکھنے کے سات دن بعد، ۳ اگست کی صبح کو گرامچی نے اچانک خون تھوکا۔ تاتیانہ کے نام ایک خط میں گرامچی نے اس خون تھوکنے کے واقعہ کی تفصیل لکھ بھیجی۔ کچھ ایسے انداز میں جیسے وہ کسی اور کے خون تھوکنے کا واقعہ بیان کر رہا ہو:

"یہ خون کی قے نہیں تھی، جیسا کہ میں نے لوگوں کو تذکرہ کرتے ہوئے سُنا ہے۔ میں نے اپنے گلے میں خرخراہٹ سُنی ———— جیسی نزلے کے وقت ہوتی ہے ———— پھر کھانسی آئی اور میرا منہ خون سے بھر گیا۔ یہ کھانسی خاص زور کی نہیں تھی۔ ایسی ہی کھانسی تھی، جو گلے میں کچھ اٹک جانے سے آجاتی ہے۔ رُک رُک کر کھانسی کا دورہ یا حملہ نہیں۔ یہ کھانسی چار بجے تک آتی رہی اور اس عرصے میں نے ۲۵۰ سے ۳۰۰ گرام خون تھوکا ۔ ۔ ۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ اس نے مجھے کچھ زیادہ کمزور نہیں کیا ۔ ۔ ۔ تو بھئی، فکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اگرچہ جیسا کہ ڈاکٹر لوگ کہا کرتے ہیں، ہمیں اس پر نظر رکھنا ہوگی۔"

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گرامچی نے ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لیے تیار کر رکھا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے جسمانی قوی جواب دے جائیں گے، لیکن اس نے جن موضوعات پر لکھنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اُن پر وہ وقتاً فوقتاً اپنی، کال کوٹھریوں میں کتابوں اور حوالوں کی عدم موجودگی کے باوجود لکھتا رہتا تھا۔ اُن دنوں وہ اطالوی عبقریوں کی تاریخ پر نوٹس تیار کر رہا تھا۔ آخر کار اس کے قوی جواب دے گئے۔ ۲۹ اگست ۱۹۳۲ء کو اس نے تاتیانہ کے نام اپنے خط میں لکھا:

"میں ایک ایسے نکتہ پر پہنچ گیا ہوں جہاں میری مدافعتی قوتیں مکمل طور پر جواب دینے کے قریب ہیں۔ مجھے نہیں معلوم نتیجہ کیا نکلے گا۔ پچھلے چند دنوں میں اتنا بیمار رہا ہوں جتنا پہلے کبھی نہیں رہا۔ پچھلے آٹھ دس دن سے میں رات کو کبھی پون گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا اور کبھی کبھی تو میری پلک بھی نہیں جھپکی۔ بے خوابی نے ممکن ہے خاص بیماریاں نہ پیدا کی ہوں، مگر یقیناً یہ ان امراض میں شدت پیدا کرتی ہے، جو پہلے سے موجود ہوں اور اس سے حالت میں ایسی ابتری آجاتی ہے کہ اپنا پورا وجود ہی ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا ہے۔"

حالت کی ابتری نے اُسے بد مزاج بھی بنا دیا۔ انھیں دنوں اس نے اسی تاتیانہ کو ہمیشہ کے لیے ماسکو چلے جانے کا مشورہ دیا۔

"جولیا سمجھتی ہے کہ تم روم میں اس لیے رُکی ہوئی ہو اور تم اپنے ماں باپ کے پاس جانے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ میرے ساتھ اپنا (نسبتاً) قریبی تعلق ختم کرنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات صحیح ہے یا صرف یہی ایک وجہ ہے یا یہ ایک وجہ ہے، جس نے تمھیں یہاں روک رکھا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو تمھیں اس کے بارے میں فیصلہ کر لینا چاہیے اور فوراً چلے جانا چاہیے۔"

انھیں دنوں اُسے دو ایسی باتوں کا علم ہوا جن کی وجہ سے اس کا ذہنی اضطراب اور بڑھ گیا۔ گرینر یتا کے خط سے اسے پتہ چلا کہ ماں قریب المرگ ہے، جبکہ کارلو نے اپنے خط میں اُسے یہ خبر دی کہ اُس کی جیل سے رہائی کے امکان پیدا ہو رہے ہیں۔ کیا ماں کے انتقال سے پہلے وہ اُسے دیکھ سکے گا، کیا اُسے رہائی مل جائے گی؟

روم پر فاشسٹوں کے قبضہ کی دسویں سالگرہ کے موقع پر کچھ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا اور کچھ قیدیوں کی قید کی مدت کم کی جا رہی تھی۔ گرامچی ان قیدیوں میں سے ایک تھا، جن کی قید کی مدت میں تخفیف کی گئی تھی۔ پھر گرامچی نے سُنا کہ

ویٹیکن اور سوویت یونین کے درمیان سیاسی قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بات چیت شروع ہونے والی ہے، لیکن مسولینی نے اس خیال کو ہی سختی سے رد کر دیا۔

اب گرامچی، اپنے جسم سے ہار جانے کے بعد، جولیا سے اپنے تعلق کو سدا کے لیے منقطع کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ جولیا کے خطاب ہی کبھی کبھار آتے تھے، جن سے گرامچی نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اب اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ جولیا اگر کچھ دن کے لیے ہی روم اور توری آنے میں کامیاب ہو جاتی تو شاید بدگمانی کے بادل چھٹ سکتے تھے، جو برسوں کی جدائی اور سرد تعطل کی وجہ سے گرامچی کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ جولیا اس وقت ۳۶ برس کی تھی۔ گرامچی کی خواہش تھی کہ وہ جولیا کو ازدواجی بندھن سے آزاد کر دے، تاکہ وہ ہو سکے تو اپنے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔

نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء میں گرامچی نے جولیا کو طلاق دینے کے بارے میں تاتیانا کو یکے بعد دیگرے تین تفصیلی خط لکھے۔

۳۰ دسمبر کو گلرزا میں گرامچی کی ماں سینورا پیپنیا کا انتقال ہو گیا۔ اس کے گھر والوں نے گرامچی کو ماں کے انتقال کی خبر سے بے خبر رکھنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ وہ اس سانحہ کو برداشت نہیں کر پائے گا۔ چنانچہ، اپنی ماں کی موت سے بے خبر، گرامچی نے تین مہینے بعد، ۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو تیریسینا کو لکھا:

"اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں، تم ایسٹر پر ماں کو میری بہترین خواہشات پہنچا نا نہ بھولنا۔ میں اس سال انہیں نام رکھے جانے کی سالگرہ کی مبارک باد دینا بھول گیا تھا اور اس پر مجھے بہت قلق محسوس ہوا تھا۔"

۱۹۳۳ء گرامچی کے لیے گزر جانے والے برس سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ حالات اور خاص طور پر اپنی صحت کے مسلسل انحطاط کا خود گرامچی کو بھی احساس تھا۔ ۲ جنوری ۱۹۳۳ء کو اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا:

"اگر ۳۲ء برا تھا تو یقینی سی بات ہے کہ ۳۳ء اس سے بدتر ہی ثابت ہوگا۔ میری صحت بہت گر چکی ہے اور مجھے جو بوجھ اٹھا کر گھسیٹنا پڑ رہا ہے، وہ مسلسل بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ جن توتوں کو میں مجتمع کر سکتا ہوں اور انہیں مجتمع کرنے کے لیے مجھے جو کوششیں کرنا پڑتی ہیں، ان کا تناسب نامساعد سے نامساعد ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی میں بے حوصلگی کا شکار نہیں ہوا ہوں، اس کے برعکس میری قوتِ ارادی اس حقیقت پسندی سے نئی طاقت حاصل کرتی ہے، جس سے میں حقائق حال کا تجزیہ کرتا ہوں . . ."

حقیقت یہ تھی کہ سانس بسانس گرامچی موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے خوابی ایک مستقل عذاب بن چکی تھی۔ اس کے دانت گر چکے تھے۔ اسے معدے کے مختلف اور تکلیف دہ عوارض لاحق تھے۔ پھیپھڑوں کی دق کے ساتھ اسے ریڑھ کی ہڈی کی دق نے بھی آ دبوچا تھا مگر عوارض کے اس ہجوم میں بھی گرامچی ذہنی قوتیں صحیح سالم تھیں۔ اور اتنی صحیح سالم تھیں کہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ذہن جسم کے اس زوال و انحطاط کا تماشائی بنا ہوا تھا اور وہ جسم کی اذیتوں سے محفوظ و مامون تھا۔ خود گرامچی کو اپنے ذہن کی اس توانائی کا پورا احساس تھا: "میں نے کئی بدصورت لمحے جھیلے ہیں اور اکثر میں نے خود کو جسمانی طور پر کمزور محسوس کیا ہے، مگر میں نے کبھی اس کمزوری کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے اور ——— جہاں تک ایسی باتوں کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ مستقبل میں اس کے آگے گھٹنے ٹیک دوں گا۔ تکلیف اور کمزوری کا مجھے جتنا احساس ہوتا ہے، اتنا ہی میں خود کو کڑا بنا لیتا ہوں اور قوتِ ارادی کے ہر ایک اونس کو مجتمع کر کے جینے کا سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔" (۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء) یہ زندگی اذیت ناک تھی اور قابلِ نفرین، مگر گرامچی ان اذیتوں کو جینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

۱۳ فروری ۱۹۳۲ء کو تاتیانہ کے نام گرامچی نے اپنے خط میں لکھا:

"کچھ عرصے سے، تقریباً ڈیڑھ برس سے، میں جو کچھ جھیل رہا ہوں، اُسے ایک مسلسل عذاب ہی کہا جاسکتا ہے۔ اب جسمانی عارضہ کا مجھ پر تیزی کے ساتھ ردعمل نہیں ہوتا۔ میں اپنی طاقت کو تحلیل ہوتے محسوس کررہا ہوں، مگر میں ہار نہیں مانوں گا اور عدم مزاحمت کی راہ منتخب نہیں کروں گا۔ ان اذیتوں کو کم کرنے یا اُن کا خاتمہ کرنے کے لیے میں معمولی سے معمولی امکان کو چاہے وہ کتنا ہی معدوم یا ناممکن کیوں نظر آتا ہو، ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ میرے خیال میں ایسے کسی معمولی سے امکان کو نظر انداز کرنا ایک طریقے سے خودکشی کے کرنے کے مترادف ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اضداد کا مجموعہ بن گیا ہوں، مگر اتنا بھی نہیں، جو میں ان بنیادی باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔"

لیکن گرامچی کے لیے یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ جسمانی عوارض اور ان کی اذیتوں نے اس کی ذہنی گرفت کو ڈھیلا یا ختم کردیا تو وہ کہیں اس حالت میں گھٹنے تو نہیں ٹیک دے گا اور رحم کی بھیک تو نہیں مانگنے لگے گا۔ گرامچی کے ذہن نے اس خدشہ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اپنی ڈائری اور اپنے خطوط میں بھی گرامچی نے اس خدشہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

تاتیانہ اس وقت توری میں ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھی اور گرامچی کے جسم کے اس مسلسل انحطاط و زوال کے ڈوبتے دل کے ساتھ مشاہدہ کررہی تھی۔ ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو گرامچی بستر سے اٹھا اور اُٹھتے ہی گر گیا۔ اس وقت اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ بغیر سہارے کے کھڑا ہوسکے۔

اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ دو ساتھیوں نے کوٹھری میں باری باری گرامچی کی دیکھ بھال کی۔ بعد میں ان دونوں رفیقوں نے گرامچی کو بتایا کہ ہذیانی کیفیت میں وہ روح کے لافانی ہونے کے بارے میں تقریر کرتا تھا اور بیچ بیچ میں وہ سارڈینیائی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگتا تھا۔ بعد میں گرامچی نے اپنی ڈائری میں اس ہذیانی دورے کے بارے میں لکھا: "لگتا ہے پوری رات میں روح کی لافانیت کے بارے میں، حقیقت پسندی اور تاریخی معنی میں، تقریر کرتا رہا یعنی ہمارے بعد ہمارے مؤثر و مفید اور ضروری اعمال باقی رہتے ہیں اور وہ ہماری خواہشات سے قطع نظر عالمی سلسلۂ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔"

"... کھڑکیوں اور دیواروں میں مجھے لوگ اور ان کے چہرے نظر آتے، خاص طور پر چہرے، ڈراؤنے نہیں بلکہ مسکراتے ہوئے چہرے، عجیب عجیب انداز میں، کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے ٹھوس، مگر اس کے باوجود رقیق ہیولے میری نظروں کے سامنے ہوا میں تیر رہے ہیں، جمع ہورہے ہیں۔ یہ ہیولے جمع ہوکر مجھ پر گرتے ہیں اور میں دھپ سے بستر پر گر جاتا ہوں۔ میری پتلیوں میں ماضی کی تصویریں ابھرتیں اور یہ تصویریں حال کی تصویروں پر چسپاں ہوجاتیں۔ مجھے سماعتی واہمے بھی سنائی دیتے۔ ذہن کو سکون دینے کے لیے میں جب بھی آنکھیں بند کرتا تو صاف طور پر مجھے آوازیں یہ کہتی سنائی دیتیں، "تم وہاں موجود ہو؟" "کیا تم سو رہے ہو؟" وغیرہ ..."

چنانچہ گرامچی کا ذہن کا ایک حصہ پوری طرح چوکنا تھا اور وہ حصہ جسم کی ہار کو اپنی ہار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس حالت میں بھی گرامچی کا ذہن رحم کی درخواست کے خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

تاتیانہ نے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ریاست کے سربراہ سے بہتر سلوک کیے جانے کی اپیل کی تھی، جس میں باہر کے کسی ڈاکٹر سے گرامچی کا معائنہ کرانے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ ۲۰ مارچ ۳۳ء کو پروفیسر امبرتو آرک اینجلی کو جیل میں گرامچی کا معائنہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ آرک اینجلی نے گرامچی کو فوراً کسی ہسپتال میں منتقل کیے جانے کی سفارش کی، مگر اس

سفارش پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔

جولیا اور بچوں کا خیال بھی گرامچی کو رہ رہ کر آتا تھا۔ ۲۷ مارچ کو اس نے جولیا کے نام اپنے خط میں لکھا: "کافی عرصے سے مجھے تمھارا کوئی خط اور بچوں کی کوئی خیریت نہیں ملی۔ اس دوران، میں نے تم کو کئی خط لکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تاتیانہ کو بھی اس عرصے میں کوئی خیر خبر یا خط نہیں ملا ہے۔ مجھے لکھو اور اطمینان دلاؤ۔"

اسی عرصہ میں گرامچی کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا، مگر گرامچی کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خبر کو اس سے مخفی رکھا گیا تھا۔ گھر سے اسے اب جو خطوط ملتے تھے، ان میں ماں کے ذکر کو مفقود پا کر گرامچی شکایت کرتا کہ اسے ماں کی خیریت سے کیوں مطلع نہیں کیا جاتا۔

تاتیانہ کو ماسکو سے ۲۹ مئی کو باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ یکم جولائی کو وہ گرامچی سے ملنے جیل گئی تو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گرامچی کی جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ گرامچی نے ایک بار پھر نہایت سختی کے ساتھ اُسے روم واپس چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن تاتیانہ بھی اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ اس نے روم واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

کچھ دن بعد گرامچی کی کوٹھری بدل دی گئی۔ کوٹھری بدلنے کے ساتھ گرامچی کی حالت میں کچھ سُدھار ہوا ——— اور گرامچی رات کو نیند کی دو تین جھپکیاں لینے لگا۔ اس نے ایک بار پھر مطالعہ شروع کر دیا اور نوٹ بکس میں نوٹس کا اضافہ بھی ہونے لگا۔

کارلو نے ۳ اگست ۱۹۳۳ء کو روم جا کر گرامچی کو ہسپتال منتقل کیے جانے کے بارے میں ایک درخواست مسولینی کے اس ڈاکٹر کو پیش کی، جو سفر میں مسولینی کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن اس درخواست کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اسی دوران پیرس میں گرامچی اور دوسرے قیدیوں کو فاشزم کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے ایک کمیٹی قائم ہو چکی تھی، جس میں رومان رولاں اور ہنری باربوسے جیسے مشاہیر شامل تھے۔ اس کمیٹی کی اپیل سے بین الاقوامی رائے عامہ متاثر ہوئی۔ فاشسٹ حکومت نے اس اثر کو ایک حد تک قبول کیا۔ اور اکتوبر میں، روم اور نیپلز کے درمیان واقع شہر فورمیا کے ایک کلینک میں گرامچی کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط وابستہ تھی کہ علاج کا ۲۰ الیرے روزانہ کا خرچ اور حفاظتی اقدامات کا خرچ گرامچی اٹھائے گا۔ گرامچی کی طرف سے یہ سارا خرچ اُٹھانے کی ذمہ داری کارلو نے قبول کی۔ ۸ نومبر کو گرامچی کی روانگی کا پروانہ آ گیا۔ گستادو تربیتی کوٹھری میں گرامچی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ تُوری جیل سے گرامچی کی روانگی کا منظر اس نے اس طرح کھینچا ہے:

"جیل کے اسٹور کی دیکھ بھال کرنے والے وارڈر کے ساتھ گرامچی اور میں سامان باندھنے لگے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے، اس نے وارڈر کو باتوں میں لگا لیا اور میں نے ۸ نوٹ بکس دوسری چیزوں کے ساتھ ٹرنک میں رکھ دیں (ان نوٹ بکس کی تعداد ۱۸ نہیں، ۱۹ تھی) کوٹھری میں واپس آنے کے بعد گرامچی کو ساری رات نیند نہیں آئی . . . صبح چھ بجے جب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ایک مسلح دستہ اسے لے جانے کے لیے آ گیا . . ."

جیل سے نکلنے پر گرامچی پر جو تاثرات مرتب ہوئے تھے، گرامچی نے انھیں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے: "چھ برس تک وہی چھتیں، وہی اونچی دیواریں، وہی تُتے ہوئے چہرے دیکھتے رہنے کے بعد ٹرین میں بیٹھتے ہی مجھے زبردست سنسنی کا احساس ہوا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس پورے عرصے میں باہر کی دُنیا کا وجود جاری وساری رہا تھا؛ اس کے کھیت، اس کے جنگل، اس کے لوگ، بچوں کے جمگھٹ، یہاں کے یہ درخت، وہاں کے وہ باغ . . . مگر اتنے عرصہ کے بعد آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر مجھے جو صدمہ پہونچا،

اس کے مقابلے میں یہ سنسنی کچھ بھی نہیں تھی"۔ ۱۹ نومبر کی شام کو ہی گرامچی سوتیا وِچیا کے جیلی ہسپتال پہنچ گیا۔ یہاں دوسرے سیاسی قیدی بھی تھے، جن میں تیرا سینی بھی تھا۔ مگر گرامچی کو اُن میں سے کسی سے بھی ملنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

۷ دسمبر ۳۳ء کو گرامچی فورمیا پہنچ گیا۔ یہاں کلینک کے اس کمرے میں، جہاں گرامچی کو رکھا گیا، ایک مسلح فوجی ہر وقت موجود رہتا تھا۔ برآمدوں اور باغ میں الگ بھگ بیس سپاہی چوکسی کے لیے تعینات رہتے تھے۔ اس چوکسی سے قطع نظر، کلینک میں گرامچی کا بہتر طریقے سے علاج معالجہ ہونے لگا تاخیر کے باوجود، اس علاج معالجہ کا گرامچی پر اچھا اثر ہوا۔ ہفتے میں ایک بار گرامچی کو باغ میں ٹہلنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

کرسمس کے موقع پر کارلو اور تاتیانہ گرامچی سے ملنے فورمیا پہنچے۔ کرسمس کے دن انھیں گرامچی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی، مگر اگلے دن ان دونوں کو گرامچی سے ملنے دیا گیا۔ کارلو اور تاتیانہ کا گرامچی نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اس کی حالت میں کسی قدر افاقہ دیکھ کر دونوں کو خوشی ہوئی۔ تیرِ سینا نے کارلو کے ہاتھ کرسمس کا تحفہ بھیجا تھا۔ کارلو نے یہ پارسل کھولنے کے لیے اس مسلح سپاہی سے ہی کہا، جو اس کمرے میں تعینات تھا۔ مسلح سپاہی کو بسکٹوں کا پیکیٹ کھولتے دیکھ کر گرامچی نے کہا: "یہ بسکٹ یقیناً ماں نے ہی بنائے ہوں گے" دونوں نے گرامچی کی رائے پر صاد کیا، کیونکہ ابھی گرامچی کی حالت ایسی تھی کہ ماں کی موت کی خبر اس کے لیے جان کاہ ثابت ہو سکتی تھی۔

۸ مارچ ۳۴ء کو گرامچی نے اپنی ماں کے نام ایک خط لکھا، جبکہ اس کے انتقال کو ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔

"پیاری ماں، پچھلے برس میں نام رکھنے کے دن کی سالگرہ پر تمھیں مبارکباد نہیں بھیج سکا تھا، کیونکہ اس وقت میں شدید بیمار تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ برس بھی میری طرف سے یہ یاد دہانی کرائے بغیر گزر جائے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ تاتیانہ نے یہاں سے میرے حالات کے بارے میں تیرِ سینا کو مطلع رکھا ہے۔ . . . حالات بہت اچھے نہیں، مگر ایک سال پہلے کے حالات کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ . . . جسمانی یا ذہنی لحاظ سے میری صلاحیتیں بحال نہیں ہوئی ہیں۔ توری میں آخری دنوں میں میری حالت نہایت خستہ ہو گئی تھی اور میری صحت کی بحالی سُست ثابت ہو رہی ہے۔ . . . مجھے نہیں معلوم تمھارا کیا حال ہے۔"

گرامچی نے اپریل ۳۴ء میں اعصابی امراض کے لیے مخصوص ہسپتال میں بھیجے جانے کی درخواست کی۔ جولائی میں گرامچی کا طبی معائنہ ہوا۔ درخواست پر فیصلہ ہونے میں تاخیر ہونے پر گرامچی نے ایک اور درخواست دی۔ اس بار اس نے مشروط رہائی کا مطالبہ کیا۔ اٹلی کے باہر گرامچی کی رہائی کی مہم جاری تھی۔ رومان رولاں نے گرامچی کی شہادت کے بارے میں ایک پمفلٹ بھی شائع کیا۔

اکتوبر ۳۴ء میں اس کی درخواست قبول کر لی گئی۔ مگر یہ رہائی محض رسمی تھی، کیونکہ مسلح پہرہ دار کو کمرے سے ہٹا کر عمارت کے باہر تعینات کر دیا گیا تھا اور اسے علاج کے لیے خاص ہسپتال یا کلینک پہنچنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی تھی، کیونکہ فاشسٹ حکومت کو یہ شک تھا کہ گرامچی فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ عملی طور پر گرامچی کی یہ 'مشروط رہائی' برائے نام ہی رہائی تھی۔

گرامچی نے اس حالت میں بھی جبکہ اس کے جسمانی قویٰ جواب دے رہے تھے، مطالعہ اور لکھنے کا کام جاری رکھا۔ فورمیا میں اپنے قیام (۱۹۳۴-۱۹۳۵ء) کے دوران گرامچی نے ایسی پانچ نوٹ بکس پُر کیں، جو اس نے توری میں شروع کی تھیں۔ اس دوران گرامچی نے زیادہ تر تصحیح، نظرِ ثانی اور اضافہ پر ہی توجہ دی۔ اس وضاحت و تشریح کی وجہ سے گرامچی کے تصورات کے خدوخال اُبھر کر سامنے آ گئے۔ ان پانچ نوٹ بکس کی تکمیل کے علاوہ، گرامچی نے گیارہ نوٹ بکس فورمیا میں قیام کے دوران پوری کیں۔ آخری نوٹ بکس میں اس کی تحریر میں جسمانی کمزوری کی جھلک صاف نظر آنے لگی تھی۔ ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں اس کی بگڑتی ہوئی حالت نے اسے کام ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں تحریروں پر وہ نظرِ ثانی بھی نہیں کر سکا۔

مشروط رہائی کے دس مہینے بعد گرامچی کو روم کے کوئی سیسانا Quisisiana کلینک میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ ۲۴ اگست ۳۵ء کو گرامچی روم کے لیے روانہ ہو گیا۔ روم کے اس کلینک میں داخلے کے بعد گرامچی کے جان لیوا امراض کا باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ گرامچی نے اس عرصہ میں جولیا سے تعلقات کی تجدید کی کوشش کی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ہی روم آجائے لیکن گرامچی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اب گرامچی نے دنیا سے قطع تعلق سا کر لیا۔ اس نے پارٹی یا اس کے کسی عہدیدار سے بھی کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۷ء کو اس کی رہائی عمل میں آنے والی تھی اور وہ اس رہائی کی امید میں ہی سانسیں گن رہا تھا۔ رہا ہونے پر وہ سارڈینیا واپس جانے اور زندگی کے باقی ماندہ دن وہیں گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

فرانسیسکو گرامچی کو جب اپنے بیٹے کے اس منصوبہ کا علم ہوا تو ۷۰ سال بوڑھے اور بیمار جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے ۱۹۲۴ء کے بعد سے گرامچی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے بھی اس سے دور تھے۔ گنارو سپین میں ری پبلکن آرمی کے ساتھ فرانکو کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ماریو افریقہ میں تعینات اطالوی فوج میں تھا۔ کارلو میلان میں کام کر رہا تھا۔ ایڈمیا گرامچی کے الفاظ میں:

"جب چچا نینو کی قید کی مدت پوری ہونے کو آئی تو انھوں نے ہمیں لکھا کہ ہم سانتو لوسرجیو میں ان کے لیے ایک کمرہ تلاش کر لیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں وہاں رہ چکے تھے اور اس کی آب و ہوا مناسب تھی۔ تیریسینا اور ایک دوست پیپینو مالدو ساتھ وہاں گئی۔ ہمیں ایک بہت اچھا کمرہ مل گیا۔ اس کے بعد ہم چچا نینو کی واپسی کے انتظار میں گن گن کر دن بتانے لگے۔ انھیں ۲۷ اپریل کو واپس آنا تھا۔ ہم نے اس دن ان کا سارے دن انتظار کیا۔ ہمیں یقین تھا وہ کسی بھی لمحہ وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ دن بیت گیا اور وہ نہیں آئے۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ دادا جان بھی اپنے بیٹے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہم نے انھیں دلاسا دیا کہ وہ کل بخیریت پہنچ ہی جائیں گے۔ اگلے دن ایک عورت ہمارے گھر آئی اور اس نے پوچھا، "کیا یہ خبر سچ ہے کہ نینو کا انتقال ہو گیا ہے؟" یہ سن کر ہم سکتے میں آگئے۔ "ریڈیو نے یہی کہا ہے۔ میں نے ریڈیو پر یہی سنا ہے۔" عورت نے بتایا۔ اس کے بعد لوگ تعزیت کے لیے آنے لگے۔ دادا جان کی طبیعت خراب تھی اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ انھیں یہ خبر دے۔ اس لیے کوئی ایک آدمی ان کے کمرے کے دروازے کے باہر موجود رہتا، تاکہ لوگوں کو اندر جانے اور انھیں یہ خبر دینے سے روک سکے۔ میں ہی اکثر وہاں موجود رہتی تھی۔ اس وقت سترہ برس کی لڑکی ہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ کسی کام سے مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ میں باورچی خانہ میں تھی کہ میں نے ان کی چیخ کی آواز سنی۔ ہم سب ان کی طرف بھاگے۔ دادا جان چیخ رہے تھے: "قاتل! ہتیارے! ان قاتلوں نے میرے بیٹے کو مار ڈالا، مار ڈالا!" مجھے یہ سب ابھی طرح یاد ہے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے: "انھوں نے میرے بیٹے کو مار ڈالا" اور وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال نوچ رہے تھے اور اپنے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ . . ."

انتونیو گرامچی نے ۲۷ اپریل کو گھر واپس پہنچنے کا وعدہ کیا تھا اور اسی دن صبح چار بجکر دس منٹ پر وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ موت کے وقت اس کی عمر ۴۶ برس تھی۔ اگلے دن دوپہر اسے نذر آتش کرنے کے لیے لے جایا گیا تو اس وقت روم میں طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ مُردہ گاڑی روم کے بازاروں سے گزر رہی تھی اور اس گاڑی کے پیچھے کارلو اور تاتیانا کی گاڑی تھی۔

۱۶ مئی کو فرانسیسکو گرامچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ بستر مرگ پر فرانسیسکو نے بار بار اس خط کو پڑھا تھا جو انتونیو گرامچی نے مقدمہ شروع ہونے سے پہلے اپنی ماں کے نام لکھا تھا:

"اپنے ذہنی سکون کے لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی بھی سزا کیوں نہ دی جائے، تم اس پر ہراساں یا رنجیدہ مت ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سمجھ لو اور محسوس کر لو کہ میں ایک سیاسی قیدی ہوں۔ اور اس میں قطعی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس پر میں شرمندگی محسوس کروں اور آئندہ بھی کسی بات پر محسوس نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سمجھ لو کہ ایک معنی میں تو میں خود قید ہونے اور سزا پانے کا خواہش مند تھا، کیونکہ میں اپنے خیالات بدلنے پر تیار نہیں تھا اور بلا شبہ میں نہ صرف ان کے لیے جیل جانے بلکہ جان تک دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ جان لو کہ اسی باعث میں ذہنی طور پر پُرسکون ہوں اور جو کچھ میں نے کیا ہے، اس پر نادم و ناخوش نہیں ہوں۔ عزیز ماں، میں تمھیں اپنے سینے سے لگا لینا چاہتا ہوں، تاکہ تم یہ جان سکو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں اور میں اس عظیم دُکھ پر تمھیں کتنا دلاسہ دینا چاہتا ہوں جو میں نے تمھیں پہنچایا ہے۔ لیکن میں اس کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے ——— نہایت سنگین۔ اور بیٹوں کو بعض اوقات اپنے ماؤں کو عظیم دُکھ پہنچانا پڑتا ہے، بشرطیکہ وہ مردوں کے طور پر اپنی عزت اور اپنے وقار کا تحفظ کرنے کے خواہش مند ہوں۔"

”مادیت پرستی کی لہر“ اور ”حاکمیت کا بحران“

انتونیو گرامچی

جدید بحران کا وہ پہلو، جسے ”مادیت پرستی کی لہر“ قرار دیتے ہوئے اظہارِ افسوس کیا جاتا ہے، وہ دراصل ”حاکمیت کے بحران“ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر حکمران طبقہ اس اجتماعی اتفاقِ رائے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے ذریعے وہ رہنمائی کردار ادا کرتا ہے اور وہ محض ایسا ”غالب“ طبقہ بن کر رہ جاتا ہے، جو محض استبدادی قوت کو استعمال کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کی بڑی اکثریت اپنے روایتی نظریات سے الگ تھلگ ہو گئی ہے اور ان باتوں پر اس کا یقین باقی نہیں رہا ہے، جن پر وہ یقین کرتی تھی۔ اس بحران کی حقیقت اس میں مضمر ہوتی ہے کہ جو چیزیں، باتیں پرانی ہو چکی ہیں، وہ جاں بلب ہیں اور جو چیزیں، باتیں نئی ہیں، وہ پیدا ہونے کی سکت سے محروم ہیں۔ اس درمیانی وقفے میں مرض کی کئی سنگین علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً نوجوان نسل کا مسئلہ، جو دراصل صاحبِ اقتدار پرانی نسلوں کے ”حاکمیت بحران“ کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میکانکی رکاوٹ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جو ان لوگوں کی راہ میں کھڑی کر دی جاتی ہے، جو نئی عملداری اور حاکمیت کے اہل ہوتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے: کیا عوام الناس اور ”حکمران نظریات“ کے درمیان اس قطع تعلق کو محض طاقت کے استعمال سے جوڑا جا سکتا ہے اور اس طرح نئے نظریات کو عملداری حاصل کرنے سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا یہ درمیانی وقفہ بحران، جس کے تاریخی لحاظ سے نارمل حل کی راہ میں اس طرح رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے، پرانے نظریات کی بحالی پر منتج ہو سکتا ہے؟ نئے اور پرانے نظریات کی ماہیت کے پیشِ نظر، اس امکان کو رد کیا جا سکتا ہے، مگر مکمل طور پر نہیں۔ اس درمیانی وقفے میں جبر و استبداد کی وجہ سے وسیع پیمانے پر منکرانہ جی بھی پھیلتی ہے . . .

اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی مادیت پرستی کی عدیم المثال توسیع کے لیے نہایت سازگار حالات پیدا کیے جا رہے ہیں . . . پرانے نظریات کی موت سبھی نظریوں اور فارمولوں کے بارے میں منکر پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور ظاہر ہوتی ہے خالص معاشی حقیقت پرستی کے روپ میں (روپیہ پیسہ اور آمدنی کو ہی سب کچھ سمجھا جانے لگتا ہے)؛ پرانے نظریات کی موت ایسی

سیاست کے روپ میں بھی ظاہر ہوتی ہے، جس کا در حقیقت، حقیقت پرستی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

لیکن ہر ایک چیز کو معیشت اور سیاست کی حدود میں تحدید کر دینے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سبھی ارفع ترین یا لاحی اصول اس سطح پر بھی آجاتے ہیں، جو اصل ڈھانچے سے مبنی مطابقت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس صورت حال میں ایک نئی تہذیب تخلیق کرنے کا امکان ابھرتا ہے اور اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

(اقتباس)

——————— "ریاست اتحاد فی معاشرہ"

(۱۹۳۰ء)

انسان کیا ہے؟

انتونیو گرامچی

یہ فلسفے کا بنیادی اور خاص سوال ہے۔ اس کا جواب کس طرح دیا جائے؟ اس کی تشریح خود انسان کے اندر تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر انسان کے اندر اس کی تشریح دریافت کی جا سکتی ہے لیکن کیا یہ درست ہے؟ ہم فردِ واحد میں یہ دریافت کریں کہ ہر "فردِ واحد" کیا ہے؟ لیکن ہمیں دلچسپی یہ جاننے سے نہیں ہے کہ ہر انسان کیا ہے، جس کے معنی ہیں یہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہر انسان کیا ہے جس کے معنی ہیں یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ ہر انسان ہر خاص لمحے میں کیا ہے۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اٹھا کر "انسان کیا ہے؟" ہم دراصل یہ پوچھنا چاہتے ہیں: "انسان کیا ہو سکتا ہے؟" جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تقدیر کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں، "خود اپنی تعمیر" کر سکتا ہے یا نہیں، خود اپنے لیے زندگی کے شیرازہ بندی کر سکتا ہے یا نہیں؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک سلسلہ ہے، ایک سلسلۂ عمل۔ جب ہم اس طرح غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال "انسان کیا ہے؟" کوئی مجرد یا "خارجی" سوال نہیں ہے۔ یہ سوال اُبھرتا ہے اس بات سے کہ ہم نے اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں کیا سوچا ہے، اور اس چیز سے متعلق کہ ہم نے کیا سوچا اور دیکھا ہے، ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہم کیا بن سکتے ہیں، آیا یہ سچ ہے اور کس حد تک سچ ہے۔ کہ "ہم اپنے آپ کو بناتے ہیں" اپنی زندگیاں تخلیق کر سکتے ہیں اور اپنی تقدیر بنا سکتے ہیں۔ ہم "اس وقت" یہ جاننا چاہتے ہیں، حال میں، اور اپنی روزمرہ کی زندگی کے خاص حالات میں یہ جاننا چاہتے ہیں۔ ہم کسی اور زندگی کے بارے میں کسی شخص کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے۔

یہ سوال اُٹھتا ہے کہ یہ جاننے کی کوشش و کاوش سے کہ انسان کی زندگی کیا ہے اس کے خاص اور متعینہ تانوں بانوں سے یہ سوال اُٹھتا ہے اور اسی سے یہ سوال اپنے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔ ان تانوں بانوں میں سب سے اہم ہیں "مذہبی" تانے بانے ——— اور ایک خاص قسم کے مذہبی تانے بانے ——— اسے کیتھولسزم (مذہبی آفاقیت) کے تانے بانے کہہ لیجیے۔ درحقیقت جب ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں "انسان کیا ہے" اس کی رضا کیا ہے۔ خود اپنی تخلیق و تشکیل اور جس قسم کی زندگی وہ جی رہا ہے اس کی تشکیل و تخلیق پر خود اس کی ٹھوس رائے سرگرمی کیا ہے؟" تو ہماری مراد ہوتی ہے: "کیا کیتھولسزم انسان کا اور زندگی کا سچا تصور ہے؟ کیتھولک ہوتے ہیں، کیتھولسزم کو ایک طرزِ حیات بنانے میں، ہم حق پر ہیں یا غلطی پر؟" ہر شخص کا دل کہتا ہے کہ کیتھولسزم کو طرزِ حیات بنانا غلطی ہے، کیوں کہ کوئی بھی کیتھولسزم کو ایک طرزِ حیات کے طور پر مکمل ڈھنگ سے نہیں برتتا، ایسے میں بھی جب وہ اپنے آپ کو کیتھولک ظاہر کرتا ہے تو ایک کٹر قسم کا کیتھولک، جو اپنی زندگی کے ہر عمل میں کیتھولک قوانین کا

اطلاق کرتا ہے، دیوزاد نظر آئے گا۔ اور اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خود کیتھولسزم کی سب سے شدید، ناقابلِ تردید تنقید بن جاتا ہے۔

کیتھولک عقیدے پر ایمان رکھنے والے کہیں گے کسی تصور پر بھی اتنی سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔ اور وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ تاریخی طور پر تو ایک ضابطہ یا قانون ہو اور غور و فکر اور عمل کے لیے دوسرا قانون جو تمام لوگوں پر یکساں لاگو ہوتا ہو۔ یہ کیتھولسزم کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح ہے کہ صدیوں سے فکر و عمل کا یہ انداز منظم رہا ہے اور اس کے نتائج بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی اور ایسے مذہب کے ساتھ نہیں پیش آئی ہے جس کے پاس اسی قسم کے نظام کی اسپرٹ ہو جس کے پاس اسی قسم کا تسلسل اور مرکزیت ہو۔ "فلسفیانہ" نقطۂ نظر سے تسکین بخش ہیں، کیتھولسزم کی ناکامی اس بات میں مضمر ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود، یہ تمام خرابیوں کی جڑ خود انسان میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی نظر میں انسان ایک واضح اور حد بستہ فرد ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک تمام تر فلسفے کیتھولک عقیدے کے ماننے والوں کی اسی پوزیشن کو دہراتے رہے ہیں۔ انسان کو ایک ایسی ذی رُوح کی شکل میں دیکھا جاتا ہے جس کو اس کی انفرادیت محدود کرتی ہے، اس کی انفرادیت کو اور اس کے جذبے کو بھی۔ اسی نکتے پر انسان کے تصور میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یعنی، ایسے انسان کا تصور کرنا ضروری ہے جس کو فعال رشتوں کے ایک سلسلے کے طور پر دیکھا جائے، جس میں انفرادیت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، غور و خوض کا یہ بنیادی عنصر نہیں ہے۔ ہر فرد میں جس انسانیت کا اظہار ہوتا ہے مختلف عناصر پر مبنی ہوتا ہے (۱) فرد (۲) دوسرے لوگ (۳) فطرت۔ دوسرا اور تیسرا عنصر اتنے سیدھے نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ فرد دوسرے لوگوں سے رشتہ مخالفت کے ذریعہ نہیں پیدا کرتا بلکہ ان سے جماعتی اتحاد کے ناتے کے ذریعے کیوں کہ وہ سادہ ترین سے لے کر پیچیدہ ترین سماجی سانچوں اور ڈھانچوں تک ہر چیز کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح انسان فطرت سے صرف اس لیے رشتہ نہیں قائم کرتا کہ وہ خود فطرت کا حصہ ہے بلکہ سرگرم عمل کے ذریعہ، کام کے ذریعہ اور تکنیک کے ذریعہ ایسا کرتا ہے۔ یہ رشتے میکانکی نہیں ہیں۔ یہ رشتے سرگرم اور شعوری ہیں۔ اور یہ کم یا زیادہ ذہانت کے مطابق ہوتے ہیں جس سے فرد لیس ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بدلتا ہے، نئے سانچے میں ڈھلتا ہے، جس حد تک وہ رشتوں کے پورے پیچیدہ سلسلے کو بدلتا ہے، اور جس کا وہ خود ڈھرا ہوتا ہے۔ اس معنی میں سچا فلسفی سیاسی ہوتا ہے۔ اور وہ سیاسی ہونے پر مجبور ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا سرگرم انسان ہے جو اپنے ماحول کو بدلتا ہے۔ یہاں ماحول اس معنی میں لینا چاہیے کہ اس میں وہ تمام رشتے شامل ہیں جن کے دائرے میں فرد داخل ہوتا ہے۔ اگر انفرادیت ان تمام رشتوں کا مجموعی سلسلہ ہے تو پھر اکتسابِ شخصیت کے معنی ہیں ان رشتوں کے شعور کا اکتساب اور شخصیت کو بدلنے کے معنی ہیں ان رشتوں کے پورے مجموعی سلسلے میں تبدیلی کرنا۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، یہ رشتے سیدھے سادے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ، کچھ غیر ارادی ہیں اور کچھ رضا کارانہ۔ مزید یہی حقیقت کہ انسان اس بات کا کم و بیش گہرا شعور رکھتا ہے (یعنی یہ جاننا کہ وہ ڈھنگ کیا ہے جس کے ذریعہ ان رشتوں کو بدلا جاسکتا ہے) یہی شعور ان رشتوں کو بدل دیتا ہے۔ ایک بار ان رشتوں کو ضروری تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی ضروری رشتے اپنے پہلوؤں اور اہمیت میں بدل جاتے ہیں۔ اس معنی پر تسلیم کرنے کا عمل طاقت ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ایک اور پہلو میں بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ یہ جاننا کافی نہیں ہے کہ ایک خاص تانے بانے کے اندر، ایک خاص لمحے میں موجود رشتوں کی مجموعی کیفیت اور خصوصیت کیا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی شانِ نزول کیا ہے، یہ چشمے پھوٹتے کس سوتے سے ہیں، وہ چنگاری کون سی ہے جو انھیں شعلہ بناتی ہے یعنی وہ نقطۂ آغاز جہاں یہ قوتِ نمو آشکار ہونا شروع ہوئی۔ کیوں کہ ہر فرد بذاتِ خود موجود رشتوں کا مرکب و مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ ان رشتوں کی تاریخ بھی ہے، ماضی کا نچوڑ۔ یہ کہا جائے گا کہ ایک فرد جو کچھ بدلنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ بہت کم ہے، بہت حقیر لیکن ذرا اس بات کو پیش نظر رکھیے کہ ہر فرد اُن تمام دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے

جو اسی کی طرح ان ہی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں، اور اگر تبدیلیاں عقل کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں، تو پھر اس صورت میں فردِ واحد گویا اپنے آپ کو ضرب دے کر ان کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کر سکتا ہے اور اس طرح ان تبدیلیوں سے کہیں زیادہ بڑی تبدیلیاں لا سکتا ہے جتنی پہلی نظر میں ممکن معلوم ہوئی تھیں۔

ایسی انجمنوں کی تعداد جن میں فرد شرکت کر سکتا ہے بہت زیادہ ہے (جتنی آدمی سمجھتا ہے اس سے کہیں زیادہ) ان ہی "انجمنوں" کے وسیلے سے فرد نسلِ انسانی کے حرکت و عمل میں حصّہ لیتا ہے۔ اس طرح جن طریقوں سے فرد فطرت کے ساتھ رشتوں کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، گوناگوں ہیں۔ کیونکہ تکنیک سے ہماری مراد صرف سائنسی تصورات و تخیلات کی مجموعی شکل نہیں ہے جن کا اطلاق، اپنے عام معنوں میں صنعت پر ہوتا ہے، بلکہ ان سے مراد "دماغی" آلات بھی ہیں، فلسفیانہ علم بھی۔

یہ عام بات ہے کہ ایسے انسان کا تصور کرنا ناممکن ہے جو سماج سے باہر جیتا ہو، جس کا وجود سماج سے باہر ہو۔ لیکن تمام ضروری نتائج، وہ بھی جن کا اطلاق افراد پر ہوتا ہے، ہمیشہ دسترس میں نہیں ہوتے۔ یہ بات بھی عام ہے کہ ایک خاص سماج میں اشیاء کے ایک خاص سماج کا ہونا ضروری ہے اور انسانی سماج کا تصور صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اشیا کے سماج کا وجود ہو۔ ان اشکال کو انفرادی مثالوں سے قطعِ نظر، اب تک ایک میکانکی اور تعین پسندانہ معنویت کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ اس لیے ردِّعمل ظاہر ہے۔ ایک ایسے نظریے کی ترتیب و نشوونما ضروری ہے جس میں ان تمام رشتوں کو متحرک اور فعال حقیقت کے روپ میں دیکھا جاتا ہے، تاکہ یہ بات بالکل صاف صاف طے ہو سکے کہ اس سرزمین کا سوتا انسان کا انفرادی شعور ہے جو جانتا ہے، جو رضا و رغبت رکھتا ہے، جو کوشش و کاوش سے کام لیتا ہے، جو تخلیق کرتا ہے کیوں کہ جاننا، چاہنا، جتن کرنا، تخلیق کرنا وغیرہ اس کی سرشت میں پہلے سے شامل ہے۔ کیوں کہ وہ اپنا تصور ایک کٹے چھٹے فرد کی حیثیت سے نہیں کرتا، بلکہ وہ امکانات کے شعور و ثروت سے لیس ہوتا ہے جو اس کو دوسروں سے اور اشیا کے سماج سے حاصل ہو سکتے ہیں جن کا اسے علم ہے (کیوں کہ ہر فرد فلسفی ہے، ایک سائنس داں وغیرہ)۔

فیور باخ کا نظریہ ہے: "انسان وہ ہے جو وہ کھاتا ہے۔" اگر بطور خود دیا جائے تو اس کی تاویل مختلف طرح سے کی جا سکتی ہے۔ اگر اس کی تاویل تنگ نظری سے اور احمقانہ بوچ پن سے کی جائے تو کہا جا سکتا ہے: "انسان وہ ہے جو وہ مادی طور پر کھاتا ہے۔" یا ـــــــ غذائیں انسان کے طرزِ فکر و خیال پر فوری اثر ڈالتی ہیں۔ مثال کے طور پر اما دے بوردیگا کے اس بیان کا خیال آتا ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص نے تقریر کرنے سے پہلے کیا کھایا تھا تو وہ اس کی تقریر کی تاویل بہتر ڈھنگ سے کر سکتا ہے ـــــــ یہ ایک بچکانہ بیان ہے جس کی تحمل مثبت سائنس بھی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ دماغ کی پرورش و پرداخت سیم اور ساگ سے نہیں ہوتی بلکہ ان غذاؤں سے، جو متوازن و یکساں قابلِ جذب مرکب میں بدل جاتی ہیں، اور متحد ہو کر دماغ کے خلیوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ یعنی غذائیں، امکانی نقطۂ نظر سے دماغی خلیوں کے لیے "یکساں فطرت" رکھتی ہیں۔ اگر یہ بیان درست ہوتا تو آپ کو بطنِ تاریخ کہیں باورچی خانے میں کارفرما نظر آتی اور انقلاباتِ زمانہ عام لوگوں کی بنیادی غذاؤں میں تبدیلیوں کے ساتھ اپنا چولا بدلتے رہتے۔ تاریخی صداقت اس کے برعکس ہے۔ انقلابی اور پیچیدہ تاریخی ارتقا نے ہی خوراک کی عادتوں کو بدلا ہے اور بتدریج غذا کے انتخاب کے "مذاق و شوق" میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اناج کی کاشت میں نظم و ضبط نے خانہ بدوشی کا سلسلہ روکا بلکہ قصّہ بالکل اس کا اُلٹ ہے۔ ان حالات نے جو خانہ بدوشی کی وجہ سے رونما ہوئے تھے، باضابطہ کاشت کی طرح ڈالی۔

بہرحال، چونکہ غذا پیچیدہ سماجی رشتوں کا ایک اظہار ہے اور ہر سماجی گروہ کا اپنا غذائی ڈھانچہ ہوتا ہے، اس لیے

اس بیان میں کچھ صداقت تو ضرور ہے کہ "انسان وہی ہے جو وہ کھاتا ہے" لیکن اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "انسان وہی ہے جو وہ پہنتا ہے" "انسان اپنی قیام گاہ ہے"، انسان وہ سلسلۂ عمل ہے جو اس کی افزائشِ نسل کرتا ہے یا یہ کہ "انسان اپنا خاندان ہے" کیوں کہ غذا، لباس، جائے رہائش، اور افزائشِ نسل سماجی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن میں، سماجی رشتوں کا پورا پیچیدہ سلسلہ انتہائی نمایاں اور وسیع پیمانے پر ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح یہ مسئلہ کہ انسان کیا ہے، ہمیشہ ایک ایسے مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، جسے کہتے ہیں "انسانی فطرت" یا عام معنی میں انسان"، اس لیے انسان کو سائنس بنا کر پیش کرنا (یعنی اس کو ایک فلسفہ بنانا) جس کا نقطۂ آغاز بنیادی طور پر "یکجائی" کا تصور ہے اور اس کی تجرید کر کے اس کو اس کے سانچے میں سمونے کی کوشش یہ سب "انسانی" کرشمہ ہے۔ لیکن کیا "انسانیت" بحیثیت حقیقت اور بحیثیت تصور، انسان کی آفرینش کا تصور ہے یا اس کے سفر کے آغاز کا یعنی اس کے نزول کا؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ نقطۂ آغاز کا نکتہ پیش کر کے دراصل اس بات کی تان صرف اس پر ٹوٹتی ہے کہ دینیات اور مابعد الطبیعیات کو کس طرح برقرار رکھا جائے! فلسفے کو کاٹ پیٹ کر آثارِ قدیمہ کا فطرت پرست علم نہیں بنایا جاسکتا۔ بنی نوع انسان میں اتحاد، انسان کا حیاتیاتی وصف نہیں ہے۔ انسان میں وہ فرق و امتیاز، جس کی تاریخ میں اہمیت ہے، حیاتیاتی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ (یعنی نسل، کھوپڑی کی ساخت، جلد کا رنگ وغیرہ کا فرق) جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ انسان وہی ہے جو کھاتا ہے۔ یورپ میں انسان اناج کھاتا ہے، ایشیا میں چاول وغیرہ —————— جس کو ایک اور بیان کی شکل دی جاسکتی ہے: "انسان وہ ملک ہے جس پر وہ آباد ہے" کیوں کہ غذا کا تعلق عام طور پر اس ملک سے ہوتا ہے جہاں انسان رہتا ہے۔ اور یہ "حیاتیاتی اتحاد" بھی تاریخ میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں انجام دے سکا ہے (انسان جب اپنی "فطری حالت" سے سب سے زیادہ قریب تھا اور وہ ایک ایسا جانور تھا جو اپنے ہمزاد کو اپنا لقمہ بنالیتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے قدرت کی نعمتوں کو "مصنوعی" طور پر پیدا کرنا نہیں سیکھا تھا) "منطقی دلایل کی صلاحیت" یا "جذبے" نے بھی یہ اتحاد نہیں پیدا کیا۔ اس کو "اتحاد ساز" حقیقت کی حیثیت سے نہیں تسلیم کیا جاسکتا کیونکہ یہ ایک متعینہ ہیئتی تصور ہے۔ یہ "خیال" نہیں، بلکہ جو واقعی خیال ہے انسانوں کو متحد اور منقسم کرتا ہے۔

٭

سب سے زیادہ اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ "انسانی فطرت" "انسانی رشتوں کا پیچیدہ سلسلہ" ہے کیونکہ یہ جواب "بن جانے" کے تصور کو اپنے اندر شامل کرتا ہے (انسان بنتا ہے، اپنے آپ کو بدلتا ہے، سماجی رشتوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے) اور اسی لیے "عام معنی میں انسان" کے تصور سے انکار کرتا ہے۔ حقیقت میں سماجی رشتوں کا اظہار انسانوں کے مختلف گروہ کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے وجود کو مانتے ہیں اور جن کا اتحاد جدلیاتی اور ہیئتی نہیں۔ انسان اپنی سرشت میں حاکمانہ اور خادمانہ، دونوں عناصر رکھتا ہے وغیرہ۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطرت ہے، تاریخ (اور اس معنی میں تاریخ جذبے یا روح کی ہم پلہ ہوتی ہے)، اگر تاریخ کو "بننے" کے معنی دے دیے جائیں جو اتحاد کو تہس نہس نہیں کرتی بلکہ اپنے اندر وہ بنیادیں سنبھال کر رکھتی ہے جو اتحاد کو ممکن بناتی ہیں۔ اس لیے "انسانی فطرت" ایک خاص انسان میں نہیں دریافت کی جاسکتی بلکہ بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں دریافت کی جاسکتی ہے (اور یہ حقیقت کہ ہم لفظ "نوع" کا استعمال اس کے فطری معنی میں کرتے ہیں، بڑی اہمیت رکھتی ہے)۔ ہر فردِ واحد میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہیں دوسرے افراد کی خصوصیات ہی واضح کرتی ہیں اور یہ فرق ان خصوصیات کا ہے جو مختلف افراد میں پائی جاتی ہیں۔ "روح" کا تصور روایتی فلسفے میں اور "انسانی فطرت" کا تصور حیاتیات میں —————— دونوں کو "سائنسی یوٹوپیا" کی حیثیت مل گئی، جن کے زیرِ اثر انسان نے خدا میں انسانی فطرت کا نظارہ دیکھی (انسان، خدا کا بیٹا ہے وغیرہ) اور یہی "یوٹوپیا" تاریخ کے لمبے، پُر پیچ اور سنگلاخ راستے کی

آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں عقلی روشنی بھی ہے اور جذباتی امیدیں بھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے، یہ سچ ہے کہ وہ مذاہب جنھوں نے خدا کے بیٹوں کی حیثیت سے انسانوں کی برابری کی تبلیغ کی، اور ساتھ ہی وہ فلسفے بھی جنھوں نے انسانوں کی برابری کا تصور منطقی دلائل کی بنیاد پر پیش کیا، دراصل پیچیدہ انقلابی تحریکوں کا اظہار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان تحریکوں نے تاریخی ارتقا کے پورے سلسلے میں مضبوط ترین کڑیوں کا کام کیا۔

یہ خیال کہ ہیگل کی جدلیات اسی تاریخی ارتقا کی آخری شکل ہے اور جدلیات معاشرتی تضادات کی آئینہ داری نہیں کرتی، بلکہ ان تضادات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ وہ خالص نظری جدلیات بن جاتی ہے، کروچے کے فلسفہ کی ہی مانند، یوٹوپیائی فکر کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔

تاریخ میں "اصلی برابری" جو "روحانیات" کا درجہ رکھتی ہے، "انسانی فطرت" کے تاریخی ارتقا کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔ اس کی شناخت ہوتی ہے "پبلک اور پرائیویٹ" کے نظام میں، "ظاہر اور مخفی" اجتماعیت میں جن کے تانے بانے "ریاست" اور عالمی سیاسی نظام میں پیوست ہوتے ہیں۔ یہاں "برابری" سے مراد وہ برابری ہے جو ایک جماعت یا انجمن کے اراکین آپس میں محسوس کریں۔ اور "نابرابری" وہ ہے جو مختلف جماعتوں یا انجمنوں کے درمیان محسوس کی جائے۔ برابری اور نابرابری جن کی قدر و قیمت ہے —— بشرطیکہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا ادراک موجود ہو۔ اس طرح ہم "فلسفے اور سیاست" کی برابری یا باہمی رشتے کے نکتے پر پہنچتے ہیں۔ یعنی خیال اور عمل کے باہمی تعلق کے سوال پر یعنی مارکسزم تک پہنچتے ہیں۔ سب کچھ سیاست ہے۔ فلسفہ بھی اور فلسفے بھی۔ اور واحد فلسفہ ہے تاریخ، اپنے سلسلۂ عمل میں۔ یعنی خود زندگی۔ اس معنی میں جرمن پرولتاریہ کے نظریے کی تاویل کی جا سکتی ہے، جو جرمن کلاسیکی فلسفے کے وارث ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معنی میں لینن کا نظریۂ عملداری اور اس کی تشریح بھی ایک بہت بڑا "مابعد الطبیعاتی" واقعہ تھی۔

فلسفے اور تاریخی مادیت کا مطالعہ

انتونیو گرامچی

یہ ایک عام حسنِ ظن ہے کہ فلسفہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، اور یہ اس لیے کہ فلسفہ ماہر عالموں کی یا پیشہ ور اور باضابطہ فلسفیوں کی دانشورانہ سرگرمی کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا حسنِ ظن ہے جس کی بیخ کنی ضروری ہے۔ اور یہ نیک کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ ثابت کریں کہ تمام انسان "فلسفی" ہیں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس "بے ساختہ فلسفے" کی حدوں کی وضاحت کریں جس سے "ہر شخص" لیس ہوتا ہے یعنی اس فلسفے کی حدوں کی وضاحت جو مندرجہ ذیل عناصر میں پوشیدہ ہوتا ہے :

۱- خود زبان، جو متعینہ خیالات و تصورات کی کُلّی امین ہوتی ہے، جو صرف و نحوی کی سطح پر محض الفاظ کا ایسا مجموعہ نہیں جو معنوی مواد سے خالی ہو۔

۲- عقلِ سلیم اور نیک طینتی۔

۳- مقبول عام مذہب اور اس لیے اعتقادات، توہمات، آرا، اندازِ نظر و عمل کا پورا نظام جن سے اسی چیز کی ترتیب و ترکیب ہوتی ہے جسے "لوک ادب" کہتے ہیں۔

یہ دکھانے کے بعد کہ ہر شخص فلسفی ہے، خالص اپنے ڈھنگ کا فلسفی سہی، غیر شعوری فلسفی ہی سہی، مگر ہے فلسفی، (کیوں کہ دانشورانہ سرگرمی ——— حتیٰ کہ "زبان ——— کا مختصر ترین مظہر بھی، دنیا کا ایک قطعی تصور رکھتا ہے) ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں، ہم اب تنقید اور باخبر ہونے کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب ہم اس سوال سے دوچار ہوتے ہیں : کیا قابلِ ترجیح یہ ہے کہ بغیر تنقیدی شعور کے "سوچا" جائے بے ربط اور بے ضابطہ ڈھنگ سے سوچا جائے، دوسرے لفظوں میں، کیا دُنیا کے اس تصور میں شرکت کی جائے جسے باہر کے ماحول نے میکانکی طور پر "مسلط" کیا ہے یعنی جس کو ان بہت سے سماجی گروہوں میں سے ایک نے "مسلط" کیا ہے جس سے ہر شخص اسی آن سے وابستہ ہو جاتا ہے جب وہ شعوری دُنیا میں قدم رکھتا ہے (وہ اُس شخص کا اپنا گاؤں ہو سکتا ہے یا صوبہ۔ اس کی جڑیں کلیسا میں اور پادری شاہی میں ہو سکتی ہیں یا اس بڈھے سر قبیلی مکھیا میں ہو سکتی ہیں جس کی عقل قانون ہے، اس چرب زبان بڑھیا میں جس کی گھٹی میں فن جادوگری کا علم ہو، یا بَدی قسم کے دانشور میں جس کو خود اُس کی حماقتوں اور بے بسی نے ترش رو بنا دیا ہو)؛ یا قابلِ ترجیح یہ ہے کہ شعوری طور پر اور تنقیدی طور پر خود ہی دُنیا کا تصور مرتب کیا جائے اور خود اپنے دماغ کے اس کام کی بنیاد پر خود اپنی سرگرمی کے میدان کا انتخاب کیا جائے، اسس

طرح دُنیا کی تاریخ بنانے میں حصہ لیا جائے اور چُپ چاپ آنکھ بند کر کے باہر سے مسلّط کیے ہوئے سانچے میں اپنی شخصیت کو نہ ڈھالا جائے؟

نوٹ : (ایک) : آدمی دُنیا کے اپنے تصوّرِ عالم کے سلسلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی گروہ سے منسلک ہوتا ہے، خاص طور پر اُن تمام سماجی عناصر سے منسلک ہوتا ہے جو اسی کی طرح سے سوچتے ہیں اور اسی کی نوعیت کا کام کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی قسم کی مطابقت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ جمِ غفیر کا انسان ہوتا ہے یا جماعت کا۔ سوال یہ ہے: یہ مطابقت کس تاریخی قسم کی مطابقت ہے؟ کس قسم کے جمِ غفیر کا آدمی ہے وہ، یعنی وہ جمِ غفیر کس قسم کا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے؟ جب وہ انسان دُنیا کا صاف تصوّر نہیں رکھتا، جب اس کا تصوّرِ عالم تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہُوا اور مربوط نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا سیدھا اور غیر مربوط ہوتا ہے تو اس صورت میں وہ بیک وقت بہت سے جمِ غفیر سے منسلک ہوتا ہے۔ اس کی اپنی شخصیت کی ترتیب و ترکیب کچھ عجیب طرح سے ہوتی ہے۔ اس میں جنگلی انسان کے عناصر اور جدید ترین اور انتہائی ترقی یافتہ، علم کے اصول یکجا ہوتے ہیں۔ اس میں تمام گزرے ہوئے تاریخی مراحل کی فرسودہ اور مقامی عصبیتیں اور پوری دُنیا میں متحد انسانی نسل کے مستقبل کے فلسفے کی مدرکات یکجا ہوتی ہیں۔ اس لیے خود اپنے تصوّرِ عالم پر تنقید کرنے کے معنی ہوتے ہیں کہ اس کو مربوط و متحد کیا جائے اور اس کو اس ارفع نقطے پر پہنچایا جائے جہاں ترقی یافتہ ترین جدید فکر پہنچ چکی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب تک کے موجود فلسفے پر بھی تنقید کی جائے۔ اس معنی میں کہ مقبولِ عام فلسفے میں اس کی تہیں سمٹ آئی ہیں۔ تنقیدی تشریح کی ابتدا ہوتی ہے اس شعور سے کہ وہ واقعی خود کیا ہے۔ یعنی "اپنے آپ کو جانو" کے اصول سے۔ یعنی اس حیثیت سے کہ یہ تاریخی سلسلۂ عمل کی پیداوار ہے جس نے مختلف نقوش و آثار کی ایک لا محدود دُنیا یکجا کر کے انسان کے حوالے کر دی ہے لیکن اُن کی کوئی فہرست یا مجلّا مرتب اور دستیاب نہیں۔

نوٹ : (دو) : فلسفے کو تاریخِ فلسفہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور نہ تہذیب کو تاریخِ تہذیب سے۔ براہِ راست فوری اور معقولیت کے معنی میں ایک شخص فلسفی نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ دُنیا کا ایک پرکھا پرکھایا اور جچا تُلا تصوّر نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ اس تاریخ سے آشنا نہ ہو جب تک اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ تاریخِ ارتقا کے کن مرحلوں کی نمائندگی کرتی ہے، اس کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو کہ یہ تصوّر دوسرے تصوّرات اور اُن کے بعض عناصر سے متضاد ہے۔ دُنیا کا صحیح تصوّر وہ ہے جو حقیقت سامنے رکھتی ہے جو اپنی عملی معنویت میں بالکل متعیّنہ ہے اور ممیّز خصوصی حیثیت رکھتی ہے۔ حال کے بارے میں سوچنا، اور اُس بالکل متعیّنہ حال کے بارے میں اس فکر و خیال کی روشنی میں سوچنا کیوں کر ممکن ہے جو ماضی کے مسائل کی بنیاد پر مرتب اور مروّج ہوئے ہوں۔ اور وہ بھی ایسا ماضی جو بہت پیچھے رہ گیا ہو اور از کار رفتہ ہو چکا ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ آدمی خود اپنے زمانے میں "غلط زمانی" کی حیثیت اختیار کر چکا ہے یعنی "خارج از وقت" کی حیثیت سے جی رہا ہے۔ وہ ایک قدیم زندہ انسان نہیں بلکہ آثارِ قدیمہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور شے جامد ہے۔ یا کم از کم وہ ایک "عجوبہ" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سماجی گروہ جو بعض طریقوں سے انتہائی ترقی پذیر جدیدیت کا اظہار کرتے ہیں، دوسرے میدانوں میں انتہائی پچھڑے ہوئے رہ جاتے ہیں اور اس کی وجہ اُن کی سماجی جگہ ہوتی ہے اور اس لیے، وہ مکمل تاریخی خود کفالت اور آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

نوٹ : (تین) : اگر یہ صحیح ہے کہ زبان میں دُنیا کے تصوّر کے عناصر شامل ہوتے ہیں تو یہ بھی سچ ہے کہ ایک آدمی کے تصوّرِ عالم کی کم یا زیادہ پیچیدگی کا فیصلہ اُس کی زبان سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف بولی میں بات چیت کرتا ہے یا جو قومی زبان سمجھتا ہے تو لیکن ناہموار ڈھنگ سے تو ایسا آدمی عالمی تاریخ پر چھائی فکر و خیال کی لہروں کے مقابلے میں، دُنیا کا کم و بیش، محدود اور قصباتی، جامد اور از کار رفتہ تصوّر رکھتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں محدود ہوں گی، کم و بیش جماعتی اور

معاشی، ——— آفاقی نہیں۔ اگر ہمیشہ غیر ملکی زبانیں سیکھنا، اور اس طرح دوسری عظیم تہذیبوں سے آشنا ہونا ممکن نہ ہو تو آدمی کو کم از کم قومی زبان سیکھنا چاہیے۔ ایک عظیم تہذیب کو ایک دوسری عظیم تہذیب کی زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے، یعنی ایک عظیم قومی زبان جو تاریخی طور پر زیادہ رچی بسی، مالامال اور پیچیدہ ہے کسی بھی عظیم تہذیب کو منتقل کر سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی زبان عالمی اظہار بن سکتی ہے لیکن کسی بولی کے بس کا یہ روگ نہیں۔

نوٹ: (چار): ایک نئی تہذیب کی تخلیق و تشکیل کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ انفرادی طور پر" اور جنل" دریافتیں کی جائیں۔ اس کے معنی خاص طور پر دریافت شدہ حقائق کی تنقیدی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں، یہی ہیں کہ ان کو سماجی سانچے میں ڈھال دیا جائے، تاکہ وہ اس طرح ان کے زندہ عمل کے لیے ایک بنیاد بن جائے۔ ہم آہنگی کا ایک عنصر، دانشورانہ اور اخلاقی نظریے کا ایک عنصر موجودہ زندگی کی حقیقت کے بارے میں مربوط اور مبسوط ڈھنگ سے سوچنے کی طرف عام لوگوں کو راغب کرنا ایک "فلسفیانہ" حقیقت ہے جو کہیں زیادہ اہمیت اور "ندرت" کی مالک ہے، اس چیز کے مقابلے میں جو کسی عاقل و دانا" کی فلسفیانہ فراست کی بدولت کسی نئی حقیقت کی دریافت کی شکل میں سامنے آتی ہے اور جو دانشوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی وراثت کی جھولی میں چلی جاتی ہے۔

عقلِ سلیم، مذہب اور فلسفے کے درمیان ربط و تعلق

فلسفہ ایک ایسا ذہنی نظام ہے جو نہ مذہب ہو سکتا ہے، نہ عقلِ سلیم۔ دیکھیے، حقیقت میں عقلِ سلیم اور مذہب کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے لیکن مذہب خود غیر مربوط اور بکھری ہوئی عقلِ سلیم کا ایک حصہ ہے۔ ویسے "عقلِ سلیم"، مذہب کی طرح ایک اسم نکرہ ہے: عقلِ سلیم صرف ایک نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی پیداوار اور صورت حال ہے۔ فلسفہ تنقید ہے، اور مذہب کی تسخیر اور عقلِ سلیم پر عبور۔ اور اس معنی میں یہ "عقلِ احسن" ہے جو عقلِ سلیم سے مختلف ہے۔

سائنس، مذہب اور عقلِ سلیم کا رشتہ

مذہب اور عقلِ سلیم ایک دانشورانہ نظام کی تشکیل نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ ایک انفرادی شعور میں بھی اتحاد و آہنگ کی سطح پر یکجا نہیں کیے جا سکتے: ان کو اتحاد و آہنگ کی سطح پر" اپنی مرضی سے "یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ کام" اختیار و اثر" سے ہو سکتا ہے جیسا کہ ماضی میں خاص حدود کے اندر ہوا ہے۔ مذہب کا مسئلہ اقرار و اقبال کے ادارے کے مفہوم میں پیش نظر نہیں ہے بلکہ عام معتقدوں کے مفہوم میں، یعنی تصور عالم اور مقررہ معیار عمل سے مطابقت کے درمیان اتحاد عقیدہ کے معنی میں لیکن اس اتحادِ عقیدہ کو "مذہب"، کیوں کہیں؟ اسے" فکر و نظر"، یا سیدھے سیدھے "سیاست"، کیوں نہ کہیں؟

عام معنی میں، درحقیقت، فلسفے کا کوئی وجود نہیں: مختلف فلسفوں اور تصوراتِ عالم کا وجود ہے اور انسان

ہمیشہ اُن ہی فلسفوں میں سے اپنے لیے انتخاب کرتا رہتا ہے۔ یہ انتخاب کس طرح ہوتا ہے؟ یہ محض دانشورانہ عمل ہے یا یہ زیادہ پیچیدہ عمل ہے؟ اور کیا اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ دانشورانہ حقیقت اور معیارِ عمل کے درمیان ایک تضاد ہوتا ہے؟ تو پھر اصلی تصوّرِ عالم کیا ہوگا: وہ جس کا اعلان دانشورانہ حقیقت کے طور پر ہوتا ہے یا وہ جو ایک شخص کی اصلی سرگرمی سے منتج ہوتا ہے، جو اس کے فعل و عمل میں پوشیدہ ہے؟ اور چونکہ عمل ہمیشہ سیاسی ہوتا ہے، کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر شخص کا اصلی فلسفہ اس کی سیاست میں پوشیدہ ہوتا ہے؟ خیال اور عمل میں تنازعہ، یعنی دو تصوراتِ عالم کی بقائے باہم، جن میں ایک کا اعلان الفاظ میں ہوتا ہے اور دوسرا جس کی وضاحت و تشریح مؤثر فعل و عمل میں ہوتی ہے، ہمیشہ بدعقیدگی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بدعقیدگی، بعض افراد کے لیے اگر ان کو فردِ واحد کی حیثیت سے دیکھا جائے، ایک اطمینان بخش وضاحت و تشریح کا کام کر سکتی ہے۔ یہ کم و بیش بہت سے گروہوں پر بھی صادق آ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات اُس وقت اطمینان بخش نہیں رہتی جب عام لوگوں کے وسیع حلقوں میں تضادات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو ایک خاص تاریخی اور سماجی نظام کے گہرے تضادات کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سماجی گروہ، جو دُنیا کا ایک اپنا تصوّر رکھتا ہے، خواہ یہ تصوّر بالکل ابتدائی کیوں نہ ہو۔ (جو اپنے آپ کو عمل میں نمایاں کرتا ہے اور اس لیے، رہ رہ کر، تشنجی شکل میں، نمایاں کرتا ہے، یعنی، جب اس قسم کا گروہ ایک نامیاتی وحدت کی شکل میں متحرک ہوتا ہے) ایسی صورت میں یہ سماجی گروہ، دانشورانہ اطاعت گزاری اور سپردگی کی وجہ سے ایک ایسے تصوّر کا اعلان الفاظ میں کرتا ہے، جو اس نے ایک دوسرے گروہ سے مستعار لیا ہے۔ ایک ایسا تصوّر جو اس کا اپنا نہیں ہے۔ اور اس مانگے کے تصوّر کے بارے میں بھی اُس کا خیال یہ ہے کہ وہ اس تصوّر کو اپنی عملی زندگی میں برت رہا ہے۔ اور ایسا اس لیے کہ وہ اس تصوّر پر "نارمل" زمانے میں عمل کر رہا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب اس کا طرزِ عمل خود مختار نہیں ہے یعنی اپنی مرضی کا نہیں ہے بلکہ تابع اور اطاعت گزار ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دکھا سکتے ہیں کہ کسی تصوّرِ عالم کے انتخاب یا اس نکتہ چینی کا عمل بجائے خود ایک سیاسی حقیقت ہے۔

اس لیے ہمیں اس کی وضاحت کرنی ہوگی کہ ہر دور میں بہت سے فلسفیانہ نظام اور رجحانات ایک ساتھ برقرار رہتے ہیں، وہ کس طرح جنم لیتے ہیں، کس طرح ان کی توسیع ہوتی ہے، توسیع و تبلیغ کے عمل میں کس طرح ان کے بہت سے دھارے بن جاتے ہیں اور کس طرح یہ دھارے مختلف سمتوں میں نکل جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دُنیا کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، خود اپنے ادراک و بصیرت کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر منظم کرنا کتنا ضروری ہے۔ بڑے مربوط ڈھنگ سے ادراک و بصیرت کے فیضان کو ٹھونک بجا کر متعین کرنا اور یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ "نظام" سے ہماری مراد کیا ہے، کیوں کہ اس کو اسکول کے تدریسی یا نصابی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔ لیکن یہ تشریح صرف فلسفے کی تاریخ کے چوکھٹے کے اندر ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خیال و فکر کی تشریح صدیوں میں کن مرحلوں سے گزری ہے، ہمارے موجودہ اندازِ فکر تک پہنچنے کے لیے کتنی اجتماعی کاوش سے کام لینا پڑا ہے۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس میں اس پورے ماضی کی تاریخ کا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔ اس نچوڑ میں اس کی غلطیاں اور لغزشیں بھی ہیں اور غلط روی بھی ——— لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ چونکہ ماضی میں ان پر اعتقاد تھا، اور چونکہ ماضی میں ان کی اصلاح ہوئی تھی، اس لیے آج ان کو ویسا اپنایا جا سکتا ہے اور آج کے لیے بھی وہ درست ہیں۔

فلسفے کے بارے میں لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے تانے بانے ہم زبان زدِ عام فقروں اور جملوں سے بُن سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ عام نقطۂ نظر کا اظہار اس جملے سے ہوتا ہے: "چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے دیکھو"۔ اگر ہم اس جملے کا

تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں یہ دعوت پوشیدہ ہے کہ صبر و تحمل اور تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کیا جائے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس میں زیادہ اہم نکتہ یہ چھپا ہوا ہے کہ اس میں غور و فکر کی دعوت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرح اپنے آپ کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی تہہ میں ایک عقلی توجیہہ کام کر رہی ہے۔ اور اس کا سامنا اسی ڈھنگ سے کرنا چاہیے یعنی عقل و شعور کی تمام قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے اور جبلی اور جذباتیت کی تیز و تند لہر میں نہیں بہہ جانا چاہیے۔ مقبولِ عام کہاوتوں کو مقبول ادیبوں کے ویسے ہی فقروں سے ملا کر دیکھا جا سکتا ہے، جہاں ہمیں "فلسفے" اور "فلسفیانہ ڈھنگ سے" جیسی اصطلاحیں ملتی ہیں ——— اور تب ہم دیکھیں گے کہ ان کی جچی تلی اہمیت ہے ——— وہ جچی تلی اہمیت اور معنویت یہ ہے کہ جبلی اور فطری ردِعمل پر قابو پایا جائے اور اس کے لیے ضرورت کے تصور کو اپنایا جائے جو خود اپنے عمل کو ایک خاص رُخ دینے میں مددگار ہوتا ہے۔ یہ ہے عقلِ سلیم کی مضبوط کڑی۔ اس کو عقلِ نیک کہہ سکتے ہیں۔ اس کی نشو و نما کرنے کی اور اس میں اتحاد و آہنگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بنا پر بھی "عالمانہ" فلسفے اور "عامیانہ" مقبولِ عام فلسفے میں فرق کیا جا سکتا ہے جو خیالات و عقائد کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے۔

یہاں پر ہم تصورِ عالم کے ہر نقطۂ نظر کا بنیادی سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ سوال ہر فلسفے کا ہے، جو اب ایک تحریک بن چکا ہے، ایک "مذہب"، ایک "عقیدہ"، دوسرے لفظوں میں، جس نے عملی سرگرمی اور ارادی حرکت و عمل کا راستہ دکھایا ہے، جس میں یہ ایک معنوی نظریاتی "مقدمہ" بن گیا ہے۔ (اس کو ایک آئیڈیولوجی کا نام دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں ایک تصورِ عالم کے اعلیٰ معنی کو شامل کر لیا جائے)، اور جو مزید لطافت کے ساتھ آرٹ میں اپنے آپ کو ظاہر کرے، آرٹ میں، قانون میں، معاشی سرگرمیوں میں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مظاہر میں۔ یہ ایک پورے سماجی بلاک کے نظریاتی اتحاد کو بچانے اور محفوظ کرنے کا مسئلہ ہے اور اگر یہ یگانگت و اتحاد قائم ہے تو صرف اسی آئیڈیولوجی کی بدولت۔ مذہبوں کی طاقت، خاص طور پر کیتھولک چرچ کی طاقت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھیں تمام "مذہبی" جمِ غفیر کے نظریاتی اتحاد کی بے حد ضرورت ہے۔ اور وہ اس بات کی جدوجہد کرتے ہیں کہ برتر دانشور عناصر کمتر دانشور عناصر سے کٹ کر الگ نہ ہو پائیں۔ اس جدوجہد میں رومن چرچ ہمیشہ سے بیحد پیش پیش رہا ہے تاکہ "سرکاری" طور پر عقیدہ دو مذہبوں میں نہ بٹ سکے یعنی ایک مذہب تو "دانشوروں" کے لیے ہو اور دوسرا "سیدھے سادے" لوگوں کے لیے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ اس جدوجہد میں خود چرچ کے لیے شدید مشکلات نہ پیدا ہوئی ہوں۔ لیکن ان مشکلات کا واسطہ اس تاریخی سلسلۂ عمل سے ہے جو پورے معاشرہ عامہ کو بدل دیتا ہے اور جس میں مجموعی طور پر تنقید کا ایک ایسا عنصر چھپا ہوا ہے جو مذاہب کے لیے تباہ کن ہو سکتا ہے، اسی لیے کلیسا نے پادریوں اور راہبوں کے اعلیٰ زمرے نے تہذیب کے میدان میں اپنی تنظیمی صلاحیت کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس دائرۂ توازن کے سب سے بڑے معمار بلاشبہ تھے یسوع مسیح۔ انھوں نے اس کو برقرار رکھنے کے لیے چرچ پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ یہ چھاپ ایک ترقی پسند تحریک ہے جو خود کلیسائی دائرے میں چلتی ہے اور اس کا مقصد ہے کہ سائنس اور فلسفے کے تقاضوں کی کسی حد تک تسکین کی جائے، لیکن اس کی رفتار اتنی سُست اور خاموش ہو اور کچھ ایسے ڈھنگ سے کہ تبدیلیاں سیدھے سادے لوگوں کو نظر نہ آئیں، خواہ یہ تبدیلیاں "اتحاد پسندوں" کی نظر میں "انقلابی" اور بلند بانگ ہی کیوں نہ ہوں۔ قادرِ مطلق پر عقیدہ رکھنے والے فلسفوں کی سب سے بڑی کمزوریوں میں سے ایک عام طور پر اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اوپر والوں اور نیچے والوں میں "سیدھے سادے لوگوں" اور دانشوروں میں نظریاتی اتحاد و آہنگ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ مغربی تمدن کی تاریخ میں یہ بات اس وقت ثابت ہو گئی جب یورپ کے پیمانے پر نشاۃ ثانیہ ناکام ہوا اور کسی حد تک اس وقت بھی جب رومن چرچ کے مقابلے میں اصلاحی تحریک کو منہ کی کھانی پڑی۔ یہ کمزوری

اسکولوں میں نمایاں ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ قادرِ مطلق پر عقیدہ رکھنے والے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا ہی تصور مرتب کر لیں جو بچوں کی تعلیم میں مذہب کی جگہ لے لے۔ اس لیے محض نام کی تاریخی صوفیت، جس کے طفیل غیر مذہبی (غیر پیشہ ور) استاد بھی، جو دراصل مذہب کو نہیں مانتے، مذہب کی تعلیم کی اجازت دے دیتے ہیں کیوں کہ مذہب بنی نوع انسان کے عہدِ طفلی کا فلسفہ ہے جس کی تجدید ہر تمثیلی طفل میں ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ آدرش وادنے ہمیشہ "عوام کے درمیان جانے" کی تحریک کی مخالفت کی ہے۔ مثلاً نام نہاد عوامی درس گاہوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں میں جانے کی مخالفت کی ہے۔ اور ایسا صرف اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اُن میں انحطاط پیدا ہو رہا تھا کیوں کہ اس صورت میں آدرش وادنے ان اداروں کو صرف سدھارنے کی کوشش کی ہوتی۔ بہر حال، یہ تحریکیں توجہ طلب نہیں اور نہ قابلِ مطالعہ۔ جس حد تک وہ مخلصانہ خلوص دکھاتے، جس حد تک وہ "سیدھے سادے لوگوں"، مضبوط قوتِ ارادی پیدا کر سکتے ——— ان کی نشوونما کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ اس طرح وہ ایسے تہذیب اور تصورِ عالم کی اعلیٰ شکل کی سطح تک بلند کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے یہاں، فلسفیانہ فکر ہو یا منظم قوتِ اور تہذیبی مرکزیت کی نامیاتی شکل ——— دونوں کی کمی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انگریز سوداگروں اور افریقہ کے نیگروں کے درمیان پہلے رابطوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ وہ سونے کی مچھلیوں کے بدلے میں انھیں دوسرے درجہ کی چیزیں دے رہے تھے دوسری طرف فکر کی نامیاتی شکل اور تہذیبی یگانگت پیدا ہو سکتی تھی اگر دانشوروں اور سیدھے سادے لوگوں کے درمیان وہ اتحاد ہوتا جو نظریے اور عمل کے درمیان ہونا چاہیے تھا یعنی، اگر دانشور نامیاتی معنوں میں عام لوگوں کے دانشور ہوتے اگر انھوں نے ان اصولوں اور مسائل کی تشریح و تاویل کی ہوتی، جو عام لوگ اپنی عملی سرگرمیوں میں سامنے لاتے تھے۔ تب ایک تہذیبی اور سماجی بلاک قائم ہو سکتا تھا۔ اب یہ گفتگو اس سوال کی طرف لوٹتی ہے جس پر زور دیا جا چکا ہے: کیا کسی فلسفیانہ تحریک کے لیے یہ کافی ہے کہ دانشوروں کے محدود گروہوں کی مخصوص تہذیب کی نشوونما کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے اور اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ ایسے خیال و فکر کی نشوونما کرتے ہوئے جو عقلِ سلیم سے برتر اور سائنسی طور پر مربوط و مبسوط ہو کبھی یہ نہ بھولے کہ سیدھے سادے لوگوں سے ناتا قائم رہے۔ اور اس کے علاوہ، ان رابطوں میں اُن مسائل کے سوتوں کی تلاش کرنی چاہیے جن کا مطالعہ کرنا ہے اور جن کا حل ڈھونڈنا ہے۔ اسی رابطے یا ناتے کے ذریعہ فلسفہ "تاریخی" بنتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ اپنے آپ کو انفرادی طینت کے دانشورانہ عناصر سے پاک کرتا ہے اور "زندگی" کی رگوں میں سرایت ہوتا ہے۔

مارکسزم اپنے آپ کو شروع میں صرف مذاکرے اور تنقید کی شکل میں پیش کر سکتا ہے، ایک ایسے نظامِ علم کی حیثیت سے جو پچھلے طریقۂ فکر اور واقعی موجود خیال و فکر (یا موجود تہذیبی دُنیا) پر عبور حاصل کرے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ "عقلِ سلیم" کی تنقید کی صورت میں نشوونما پائے۔ (یعنی اس مرحلے کے بعد کہ یہ عقلِ سلیم کو بنیاد بنا کر یہ دکھائے کہ "ہر شخص ایک فلسفی ہے اور یہ سوال اس کا نہیں ہے کہ ایک بالکل نئی سائنس کو "ہر شخص" کی انفرادی زندگی میں داخل کیا جائے، بلکہ سوال اس کا ہے کہ اس فلسفے میں جو موجود ہے، ایک نئی جان ڈال دی جائے اور اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے) اور دانشوروں کے فلسفوں کی تنقید کی حیثیت سے بھی، جن سے فلسفے کی تاریخ کی ترکیب ہوتی ہے اور جس کو انفرادی طور پر، (اور نہ درحقیقت، خاص طور پر ہونہار اور ذکاوت سے مالا مال افراد کی سرگرمی سے نشوونما پاتا ہے) عقلِ سلیم کی ترقی کے "ارفع نکتوں" میں شمار کیا جا سکتا ہے کم از کم سماج کے مہذب حلقوں کی عقلِ سلیم کے "ارفع نکتوں" میں شمار کیا جا سکتا ہے یہ ان کے ذریعہ عام لوگوں کی عقلِ سلیم کے "ارفع نکتوں" میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے فلسفے کے مطالعے کے لیے تعارف میں ان مسائل پر مجموعی بحث ضروری ہے جو مجموعی تہذیب کے ارتقا میں پوشیدہ ہیں، لیکن جس کا اظہار فلسفے کی تاریخ میں جزوی طور پر ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر، عقلِ سلیم

کی تاریخ کی غیر موجودگی میں حوالے کا سب سے بڑا وسیلہ رہتا ہے ——— اس حوالے کی بدولت ان پر غور و خوض کرنے میں، ان کی زندہ اہمیت و مقصودیت کو ظاہر کرنے میں (اگر وہ اب تک زندہ ہے) اور ماضی میں اس کی اہمیت و معنویت کو اُجاگر کرنے میں، اور نئے موجودہ مسائل اور پرانے مسائل کی موجودہ ترکیب کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اعلیٰ فلسفے اور عقلِ سلیم کے درمیان رشتے کو "سیاست" متعین کرتی ہے، ٹھیک جس طرح سے دانشوروں کی آفاقیت اور "سیدھے سادے لوگوں" کی آفاقیت کے درمیان رشتہ سیاست قائم کرتی ہے۔ یہ حقیقت کہ چرچ کو "سیدھے سادے لوگوں" کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ثابت کرتی ہے کہ "معتقدوں" کی برادری کے اندر ہی دراڑ پڑ گئی ہے۔ یہ ایسی دراڑ ہے جس کو "سیدھے سادے لوگوں" کو دانشوروں کی سطح پر لا کر نہیں پاٹا جا سکتا۔ (چرچ اس قسم کا بیڑا اٹھاتا بھی نہیں کیونکہ یہ بیڑا اس کی حقیقی قوتوں کے لیے آدرش کے نقطۂ نظر سے اور معاشی طور پر بہت ہی عظیم الشان ہے) یہ کام صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ دانشوروں پر آہنی نظم و ضبط لاگو کیا جائے تاکہ وہ تفریق کی خاص حدوں سے آگے نہ نکل سکیں اور اسے تباہ کن اور ناقابلِ تلافی نہ بنا سکیں۔ ماضی میں معتقدوں کی برادری کے اندر "دراڑوں" کو زبردست عوامی تحریکوں سے پاٹا گیا تھا یا جن کو طاقتور شخصیتوں (فرانسیس، ڈومینیک) کے گرد نئے مذہبی نظام کی تشکیل کر کے جذب کر لیا گیا تھا۔

لیکن ردِ اصلاح نے عوامی قوتوں کی نمو کی صلاحیتوں کو ختم کر دیا یسوع مسیح کی انجمن آخری بڑا مذہبی نظام ہے، جس کی بنیاد رجعت اور اختیار و عمل داری پر ہے، جس کا کردار جابرانہ اور "مدبرانہ" ہے جس کے آغاز نے کیتھولک تنظیم و تشکیل کے اندر درشتی اور سختی کی غمازی کی۔ نئے نظام، جو اس کے بعد اُبھرے اُن کی مذہبی اہمیت بہت مختصر تھی لیکن معتقدوں کے عام حلقوں میں "ضبط و اثر" کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بہت تھی۔ یہ یسوع مسیح کی انجمن کی شاخیں اور دھارے ہیں یا بن گئے ہیں ——— اس سیاسی پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے جو حاصل ہو چکی ہے "مزاحمت" کے حربے ہیں۔ یہ تجدید ارتقا کی قوتیں نہیں ہیں۔ آفاقیت "یسوع پرستی" میں بدل چکی ہے۔ نئے عہد نے "مذہبی نظاموں" کی تشکیل کا نظارہ نہیں کیا ہے۔ نئے عہد نے سیاسی پارٹی کی پیدائش کا نظارہ کیا ہے۔ مثلاً کرسچین ڈیماکریٹس۔

مارکسزم اس کیتھولک پوزیشن کی ضد ہے: مارکسزم "سیدھے سادے لوگوں" کو زمانہ قدیم کے فلسفے میں جو عقلِ سلیم کا فلسفہ ہے، مبتلا رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کو زندگی کے اعلیٰ و ارفع تصور کی سطح پر لے جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اس ضرورت پر اصرار کرتا ہے کہ دانشوروں اور سیدھے سادے لوگوں کے درمیان ربط و تعلق پیدا ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مارکسزم عام لوگوں کی نچلی سطح پر سائنسی سرگرمی کو محدود کرنا چاہتا ہے یا اسی سطح پر اتحاد برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ نہیں، اس کا قطعی مقصد یہ ہے کہ ایک دانشورانہ اخلاقی بلاک (محاذ) بنایا جائے جو سیاسی طور پر صرف دانشوروں کے چند گروہوں کی نہیں بلکہ عوام کی دانشورانہ نشو و نما کو ممکن بنائے۔

عوام کا سرگرم آدمی عملی کام کرتا ہے۔ لیکن اسے اپنے حرکت و عمل کا نظریاتی شعور نہیں ہوتا۔ یہ شعور دُنیا کا علم بھی ہے اس حد تک جس حد تک وہ اس کو بدلتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا نظریاتی شعور تاریخی طور پر اس کے حرکت و عمل کے عین منافی ہو سکتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے دو شعور ہوتے ہیں (یا ایک متضاد شعور) ایک وہ جو اس کے حرکت و عمل میں مضمر ہوتا ہے جو حقیقت کو عملی طور پر بدلنے میں اس کو اپنے رفقائے کار سے متحد کرتا ہے اور دوسرا وہ جو سطحی طور پر نمایاں ہوتا ہے جس کا اظہار زبانی ہوتا ہے اور جو اس کو ماضی سے ورثے میں ملا ہے اور جس کو وہ بنا چون و چرا قبول کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود، یہ (سطحی) "زبانی" تصور بے نتیجہ یا بے اثر نہیں ہے۔ یہ تصور اس کو ایک خاص سماجی گروہ سے وابستہ کر دیتا ہے، اس کے اخلاقی رویے اور عمل کو متاثر کرتا

ہے اور اس کے عزم و ارادے کے رُخ کو خاص شدت سے متعین کرتا ہے اور یہ اس نقطے پر پہنچ سکتا ہے جہاں اس کے ضمیر کا تضاد اس کے عمل کا راستہ مسدود کرسکتا ہے، اس کے فیصلے اور انتخاب کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ تصور ایک قسم کی اخلاقی اور سیاسی بے حسی اور بے عملی پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے تنقیدی خودآگہی سیاسی "غلبوں" کی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے، جن کی سمتیں مخالف ہوتی ہیں، پہلے تو یہ جدوجہد اخلاقیات کے میدان میں ہوتی ہے، اس کے بعد سیاست میں اور اس کا خاتمہ ہوتا ہے حقیقت کے خود اپنے تصور کی اعلیٰ تر تشریح پر۔ ایک پُرعزم غالب قوت کا حصّہ ہونے کا احساس و شعور آگے کی اور زیادہ ترقی پسند خودآگہی کی طرف پہلا قدم ہے جس میں انجام کار نظریہ اور عمل مدغم ہوجاتے ہیں۔ اس لیے نظریے اور عمل کا اتحاد بھی ایک طے شدہ میکانکی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کے رونما ہونے کا سلسلہ عمل ہے، جس کے اپنے ابتدائی اور قدیم مرحلے ہیں، ——— "امتیاز" اور "علیحدگی" کے معنوں میں، جبلّی خودمختاری کے معنوں میں! یہ سلسلہ ترقی کرکے اس نقطے تک پہنچا ہے جہاں دُنیا کا مربوط و مبسوط تصور سچے معنوں میں مکمل طور پر حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ غلبے یا قیادت کا تصور فلسفے میں اگلے قدم کی نمایندگی کرتا ہے، فلسفے میں اور عملی سیاست میں بھی، کیوں کہ اس کے معنی ہیں دانشورانہ اتحاد اور ایک ایسی اخلاقیات کی ترویج جو حقیقت کے تصور سے ہم آہنگ ہو۔ ایک ایسا تصور جو عقلِ سلیم کی حدوں سے آگے جاچکا ہے اور اب تک محدود فیصلوں کے اندر اسیر رہنے کے باوجود ایک تنقیدی رویہ اختیار کرچکا ہے۔

بہرحال، حال میں مارکسزم کی جو نشوونما ہوئی ہے، اس میں نظریے اور عمل کے اتحاد کے تصور میں گہرائی اور گیرائی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے: میکانکیت کی باقیات اب تک موجود ہیں۔ اسی لیے کہ اب تک نظریے کا ذکر ایک "تکملہ" کی حیثیت سے، عمل کے معہ کی حیثیت سے، عمل کے منسلکہ جزو کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس سوال کو بھی تاریخی طور پر پیش کیا جائے، یعنی یہ سوال بھی دانشوروں کے سیاسی سوال کے ایک پہلو کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ تنقیدی خودآگہی، تاریخی اور سیاسی طور پر دانشور عملے کی تشکیل کی نمایندگی کرتی ہے: ایک انسانی ہجوم اپنے آپ کو "نمایاں" نہیں کرتا اور "بذاتِ خود" مختار نہیں ہوتا جب تک کہ وسیع معنوں پر منظم نہ ہو یعنی منظم کرنے والوں اور رہنماؤں کے بغیر، نظریۂ عمل کے نظریاتی پہلو کے بغیر "نمایاں" اور "بذاتِ خود" خودمختار نہیں ہوتا۔ یہ ٹھوس طریقے سے ایسے لوگوں کے ممتاز گروہ کی شکل میں نمایاں اور ممیز ہوتا ہے جو اس کی تصوراتی اور فلسفیانہ تشریح و تاویل میں "خاص مہارت" رکھتے ہیں۔ لیکن دانشوروں کی نشوونما کا یہ سلسلہ ایک لمبا اور مشکل سلسلہ ہے۔ تضادات سے پُر، جس میں قدم آگے بھی بڑھتے ہیں اور پیچھے بھی ہٹتے ہیں، جن میں شیرازہ بکھرتا بھی ہے اور نئی شیرازہ بندیاں بھی ہوتی ہیں۔ جس میں عام لوگوں کی "وفاداری" کو ("وفاداری" اور نظم و ضبط ابتدا میں ایسی شکلیں ہیں جو عوام سے وابستگی اور وفاداری کی بنا پر اور تہذیبی مظہر کے ارتقا میں ان کی شرکت کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔) بعض مرتبہ بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی کا سلسلہ دانشوروں اور عوام کے مابین جدلیاتی رشتے کا پابند ہوتا ہے۔ دانشوروں کا حلقہ تعداد اور کیفیت دونوں میں نشوونما پاتا ہے لیکن ایک نئی "بالیدگی" اور "پیچیدگی" کی طرف دانشوروں کی جست سیدھے سادے، کم غیر کی ملتی جلتی تحریک سے وابستہ رہتی ہے۔ یہ سیدھے سادے عام لوگ وہ ہیں جو تہذیب کی اعلیٰ سطح تک اُٹھتے ہیں اور ساتھ ہی خاص مہارت و ذکاوت رکھنے والے دانشوروں کی سطح کی طرف بڑھتے ہوئے کم و بیش اہم افراد یا گروہوں کی پیش قدمی کے طفیل اپنا حلقہ اثر بڑھاتے ہیں۔ لیکن اس پورے سلسلے میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب عام لوگوں اور دانشوروں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوجاتی ہے (یا تو بعض افراد کے درمیان یا ان کے ایک گروہ کے درمیان) ناتا ٹوٹ سا جاتا ہے۔ اور اسی لیے (نظریے کے متعلق) یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ایک تکملہ ہے، ایک

تابع "جزو"۔ نظریے اور عمل کے باہمی رشتے میں "عمل" کے عنصر پر اصرار جب نظریے اور عمل کی تفریق ہو چکی ہو، جب دونوں الگ ہو چکے ہوں یعنی جب دونوں عناصر محض امتیاز کی سطح پر نہ ہوں، (مطلب یہ کہ جب ان کی سطح محض میکانکی اور روایتی ہو) تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نسبتاً قدیم تاریخی دور سے گزر رہے ہیں، جو اب تک معاشی اور جماعتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، جہاں "ڈھانچے" کا چوکھٹا موٹے موٹے طور پر تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی کمیت کی تبدیلی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مناسب کیفیاتی بالائی عمارت ابھی اُبھر رہی ہے، لیکن اس کی نامیاتی تنظیم و تشکیل مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں اس اہمیت و معنویت پر زور دینا چاہیے جو جدید دُنیا میں سیاسی پارٹیاں تصورِ عالم کی تشریح و تبلیغ کے سلسلے میں رکھتی ہیں۔ اس معنی میں کہ یہ پارٹیاں اپنے لیے موافق اخلاقی کسوٹی اور پالیسی مرتب کرتی ہیں۔ اس لیے معنی یہ ہیں کہ یہ پارٹیاں تقریباً تاریخی "تجربہ ساز" کا کام کرتی ہیں جو ان تصورات پر تجربہ کرتی ہیں۔ پارٹیاں انفرادی طور پر محنت کش عوام کو چنتی ہیں یہ انتخاب عملی میدان میں بھی ہوتا ہے اور نظریاتی میدان میں بھی۔ ان کے یہاں عمل اور نظریے میں زیادہ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ان کے تصورات زیادہ گہرے اور بنیادی طور پر جدت طلب ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا رویہ پرانے خیال و فکر کی طرف معاندانہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیاں نئے متحدہ اور ہمہ گیر دانشورانہ نظاموں کے شارح کا کام کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیاں حقیقی تاریخی سلسلۂ عمل کے مفہوم میں عمل اور نظریے میں اتحاد پیدا کرنے والی قوت کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ ضروری ہے کہ پارٹیاں انفرادی رکنیت کی بنیاد پر بنائی جائیں ——— "لیبر پارٹی" کی طرح نہیں (یعنی مسئلہ رکنیت کی بنیاد پر) کیوں کہ اگر مقصد یہ ہے کہ "تمام معاشی طور پر سرگرم عام لوگوں" کی تنظیمی طور پر رہنمائی کی جائے، تو پھر پرانی اسکیم کے مطابق نہیں بلکہ نئی اسکیموں کی تشکیل کر کے ان کی رہنمائی ہونی چاہیے۔ اس سلسلۂ عمل کے ابتدائی دَور میں عام لوگوں کی شمولیت محض عملے کی حیثیت سے ہوتی ہے، جن کے اندر انسانی سرگرمی میں پوشیدہ تصور کسی حد تک واقعی مربوط . . . اور باضابطہ شعور کی شکل اختیار کر چکا ہے، قطعی اور فیصلہ کُن ارادے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ان مرحلوں میں سے ایک اس بحث میں زیرِ مطالعہ آسکتا ہے جہاں مارکسزم کی تازہ ترین نشو و نما نے جم کر اپنا اظہار کیا ہے۔ یہ وہ بحث ہے جو اختصار کے ساتھ د۔ س۔ میرسکی کے مضمون میں سمٹ آئی ہے جو گمتورا کے ممدود و معاون ہیں۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک میکانکی اور مطلق تصور کی منزل سے نکل کر وہ کس طرح عمل کا تصور بن گیا ہے۔ جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے، اس میں فکر و عمل کے اتحاد کا قریب قریب صحیح تصور اُبھرتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ ابھی یہ تصورِ اتحاد و آہنگ کی مکمل اہمیت و معنویت کی سطح پر نہیں پہنچا ہے۔

جب جدوجہد میں پیش قدمی کی عنان ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ اور جب جدوجہد انجام کار ہزیمتوں کے ایک پورے سلسلے سے جُڑ کر رہ جاتی ہے، تو میکانکی تعین پسندی، اخلاقی مزاحمت کی عظیم الشان طاقت بن جاتی ہے، صبر و تحمل کی ہٹ دھرم کوشش و کاوش: "بس اس وقت ایک آن کو مجھے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے، لیکن آخر میں صورتِ حال میرے حق میں ہوگی" وغیرہ۔ اصل ارادے پر عقیدے نے پردہ ڈال دیا ہے۔ اسے تاریخ کا ناقابلِ گریز عقلی نباہ کہہ لیجیے، جو انجام کار کی قدیم اور آزمائشی علم پرستی کی شکل ہے، جو عاقبت اندیش یا مرضیِ خدا وغیرہ کی جگہ لے لیتی ہے، جو اقبالِ گناہ والے مذہبوں کی ایک شکل ہے۔ ہمیں اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ ان صورتوں میں بھی، درحقیقت، ایک مُنہ زور ارادے کو دخل ہے، جو "صورتِ حال" پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن بلاشبہ یہ ایک مضمر اور پوشیدہ شکل ہے، اپنے آپ سے منفعل۔ اس لیے اس کا شعور متضاد ہوتا ہے۔ اس میں تنقیدی اتحاد وغیرہ کی کمی ہوتی ہے۔ لیکن جب "تابع" رہنما بن جاتا ہے اور جب وہ عام لوگوں کی معاشی سرگرمی کا ذمہ دار

بن جاتا ہے تو میکانکیت ایک خاص لمحے میں لازمی خطرہ بن کر نمودار ہوتی ہے، تب پورے اندازِ فکر پر نظرِ ثانی کی منزل آتی ہے کیوں کہ اس وقت تک سماجی طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر "صورتِ حال" کی طاقت کی حدیں کیوں متعین ہو جاتی ہیں؟ اس لیے کہ اس کی تہہ میں حقیقت پوشیدہ ہے کہ اگر کل تک تابع ایک شے تھا تو آج وہ اب شے باقی نہیں رہا، بلکہ ایک تاریخی شخص بن چکا ہے۔ اگر کل تک وہ غیر ذمہ دار تھا، کیوں کہ وہ خارجی مرضی کے خلاف "مزاحمت" کر رہا تھا تو آج وہ ذمہ دار ہے کیوں کہ اب وہ مزاحمت نہیں کر رہا ہے بلکہ آلۂ کار بن چکا ہے۔ اس لیے لازمی طور پر سرگرم اور پُرانا امکان ہے۔ لیکن کیا کل بھی وہ محض "شے" تھا، محض "غیر ذمہ داری"؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ مقدر پرستی کمزوروں کے لیے سرگرم اور اصلی ارادے پر پردہ ڈالنے کا ایک حیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ یہ ضروری ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ میکانکی تعین پرستی کس قدر بیکار ہے جو عام لوگوں کے بھولے بھالے فلسفے کو نمایاں کرتی ہے۔ اور صرف اس طرح طاقت کے فطری عنصر کی حیثیت سے، یہ بے عملی کا، بتدریج خود کفالت کا سبب اس وقت بن جاتی ہے جب دانشور اس کو فعال اور مربوط فلسفے کی شکل دے دیتے ہیں۔ اور یہ سب اس بات کی توقع کیے بغیر کہ تابع بدل کر ممیز اور ذمہ دار کی جگہ لے سکتا ہے۔ تابع عوام کا ایک حصّہ تو ہمیشہ ممیز اور ذمہ دار رہتا ہے۔ اور جزو کا فلسفہ کُل کے فلسفے کے پیش رو کا کام کرتا ہے۔ صرف نظریاتی پیش بینی کے طور پر نہیں، بلکہ حقیقی ضرورت کے طور پر۔

یہ حقیقت کہ میکانکی تصوّر تابع کے مذہب کی شکل اختیار کرتا رہا ہے، کرسچین مذہب کے ایک تجزیے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ بعض زمانوں میں اور خاص تاریخی حالات میں یہ ایک "لازمہ" رہا ہے اور لازمہ ہے۔ ایک لازمی شکل جو اس نے عام لوگوں کی مرضی سے اختیار کی ہے، دنیاکی اور زندگی کی عقلیت کی ایک متعینہ شکل کی حیثیت سے۔ اور اسی نے حقیقی عملی سرگرمی کے لیے عملہ فراہم کیا ہے۔ اس مختصر سے اقتباس میں لا سیولتا کیتھولیکا (۵ رمارچ ۱۹۳۲ء) سے لیا گیا ہے، کرسچین مذہب کا یہ رول نمایاں ہو جاتا ہے:
"نیک عاقبت پر عقیدہ، سرشاری نصیب روح کی ابدیت پر عقیدہ، نشاطِ جاوداں سے ہم کنار ہونے کے تصوّر پر عقیدہ، زبردست باطنی تکمیل اور رُوحانی بالیدگی کے لیے فکر و عمل کا سرچشمہ تھا۔ سچی کرسچین انفرادیت پرستی تو اس سے اپنی فتوحات کے لیے حوصلہ نصیب ہوئی۔ اسی نیک مقصد کے گرد ہی کرسچین کی تمام طاقتیں مجتمع تھیں۔ قیاس آرائیوں کے مدوجزر سے نجات پاکر، جو روح کو مجروح و مضمحل کرتی تھیں، لافانی اصولوں سے بصیرت حاصل کر سکے۔ انسان کو احساس ہوا کہ اُمید نے نیا جنم لیا ہے، اس یقین سے لیس ہو کر کہ کوئی کبریائی قوت ہے جو شر کے خلاف جدّوجہد میں اس کی یاوری کرتی ہے، اس نے اپنے آپ کو تشدد کا شکار بنایا اور اس طرح دُنیا کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔" لیکن اس سلسلے میں بھی مراد بھولے بھالے کرسچین مت سے ہے۔ اس سے مراد یسوعی کرسچین مت نہیں ہے جو عوام کے لیے افیون بن گیا ہے۔

کلاوِن ازم، پیش تقدیر اور خدا کی رحمت کے تصوّر کی بنا پر جس نے تسخیر و توسیع کے جذبے کو جگایا (یا اس تحریک کی شکل بن گیا) اب تک بہت پُرمعنی اور اہم ہے۔

مقبولِ عام بننے کے دوران، دُنیا کے نئے تصوّرات پنپتے اور پھیلتے ہیں۔ توسیع و تبلیغ کے اس سلسلۂ عمل میں (جو بیک وقت پُرانے کا نعم البدل ہے اور اکثر پرانے اور نئے کا امتزاج) اس عقلی شکل کا (کس طرح اور کس حد تک) اثر پڑتا ہے۔ اس عقلی شکل کا جس میں نئے تصوّر کی نشوونما ہوتی ہے اور جس شکل میں یہ تصوّر سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ کام مبلغ کے اثر و اختیار سے ہوتا ہے یا ان مفکروں اور عالموں کے ذریعہ جن کو شارح اپنی حمایت اور مدد کے لیے آمادہ کرتا ہے اور اس تنظیم کی رکنیت کے ذریعہ بھی جو نئے تصوّر کی حمایت کرتی ہے (لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ تنظیم میں شمولیت دوسرے مقاصد کی بنا پر ہوئی ہو —— یعنی جو

نئے مقاصد تصور میں محض شرکت کے مقصد سے مختلف ہوں) یہ عناصر درحقیقت، سماجی گروہ کی نوعیت کے مطابق ادلتے بدلتے رہتے ہیں ـــــــ سماجی گروہ کی نوعیت کے مطابق اور اس گروہ کی تہذیب کے مطابق۔ لیکن تحقیق و جستجو خاص طور پر عام لوگوں میں بہت دلچسپ ہو جاتی ہے، جو اپنے عقاید اور خیالات زیادہ مشکل سے بدلتے ہیں۔ اور جو بہر حال میں، ان عقاید و خیالات کو اس طرح نہیں بدلتے کہ ان کی جگہ نئے خیالات کو ہو خالص شکل میں قبول کر لیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ نئے خیالات کو کم و بیش ایک عجیب و غریب معجون کی شکل میں قبول کرتے ہیں۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی منطقی طور پر مربوط و ہموار شکل، منطق و مذاکرے کی جامعیت، جو مثبت یا منفی دلائل کو، خواہ وہ فنی ہوں، نظر انداز نہیں کرتی، اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کن ہونے کی منزل سے بہت دور ہے۔ یہ فیصلہ کن ہو سکتی ہے، اگر چھوٹے طور پر۔ ایسے میں جب ایک خاص شخص دانشورانہ بحران کی حالت میں ہو، جب وہ پرانے اور نئے کے درمیان بھٹک رہا ہو، جب پرانے پر سے اس کا عقیدہ اٹھ تو گیا ہے لیکن ابھی اس نے نئے کے حق میں فیصلہ نہیں کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مفکروں اور عالموں کے اثر کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ عام لوگوں پر اُن کا اثر زبردست ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر تصور کے اپنے مفکر اور عالم ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کا اثر درسوخ و اختیار بٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مفکر تجزیہ کر سکتا ہے، خود اس نے جو کچھ کہا ہے اُس پر شک کر سکتا ہے، وغیرہ۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ نئے تصورات کی تبلیغ و توسیع کا سلسلۂ عمل سیاسی اسباب کی بنا پر، یعنی آخر میں، سماجی اسباب کی بنا پر رونما ہوتا ہے۔ لیکن منطقی ربط و آہنگ اثر و اختیار اور تنظیم کے ہیئتی عناصر، افراد میں بھی اور گروہوں میں بھی، اس سلسلۂ عمل میں بہت بڑا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عام لوگوں میں فلسفے کا وجود صرف ایک عقیدے کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، عوام کے آدمی کی دانشورانہ پوزیشن کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اُس آدمی کی تشکیل ہوتی ہے اس کے خیالات و تصورات، عقیدوں سے، امتیاز و تفریق کے معیاروں اور طور و طریق کے معمولات سے۔ کوئی بھی شخص جو اس کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اس وجہ سے کہ وہ دانشورانہ طور پر برتری رکھتا ہے، اُس سے بہتر دلائل پیش کر سکتا ہے، اور اپنی منطق سے اس کو دو ڑا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا، اس لیے عوام کا آدمی اپنے عقائد بدل دے؟ صرف اس لیے کہ وہ وقتی بحث میں اپنا لوہا منوانے میں ناکام رہا؟ لیکن تب تو صورتِ حال کچھ اور ہو جائے گی۔ تب تو اسے روزانہ اپنے خیالات بدلنا پڑیں گے۔ یا جب بھی کسی ایسے نظریاتی حریف سے پالا پڑے جو دانشورانہ برتری کا مالک ہے تو اس صورت میں اپنے خیالات سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ تو پھر کن عناصر پر اس کا فلسفہ قایم ہے؟ خاص طور پر فلسفے کی اس خاص شکل میں جس میں فعل و عمل کے معمول کی حیثیت سے وہ متعلقہ شخص کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟ بلا شبہ سب سے زیادہ اہم عنصر ہے ایک غیر عقلی عنصر یعنی عقیدہ۔ لیکن کس پر عقیدہ۔ کس چیز پر عقیدہ؟ خاص طور پر اس سماجی گروہ پر عقیدہ جس سے اس کا واسطہ ہے، اس حد تک جس حد تک وہ موٹے موٹے طور پر سوچتا ہے۔ عوام کا آدمی یوں سوچتا ہے کہ اتنی اہم چیز کے بارے میں، اتنے سارے لوگ اتنے غلط نہیں ہو سکتے جتنا کہ میرا حریف اپنے دلائل کے زور سے ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں خود اپنے خیال کی تائید میں اتنے زوردار ڈھنگ سے اپنے دلائل نہیں پیش کر سکتا جس طرح میرا حریف کر سکتا ہے لیکن میرے اپنے گروہ میں ایسے لوگ ہیں جو اتنے ہی زوردار ڈھنگ سے اپنے دلائل پیش کر سکتے ہیں، بلکہ میرے حریف سے زیادہ اچھی طرح یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس کو یاد آتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے حق میں مکمل طور پر مدلل تفسیرات سُن چکا ہے، جو بڑے مربوط ڈھنگ سے پیش کی گئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے عقیدے پر قائم رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب اگر اصلی دلائل اس کو یاد نہیں رہے اور وہ ان کو پیش نہیں کر سکتا، تو بے چارا کیا کرے۔ یہ حقیقت کہ وہ ایک بار قایل ہو چکا ہے۔ اور عقیدے کو اپنا چکا ہے، جیسے کوئی بجلی چمکی ہو اور اس پر سب کچھ عیاں ہو گیا ہو، اس کو راسخ العقیدہ بنانے میں بنیادی عنصر کا کام کرتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اب اپنے عقیدے کے حق میں قایل کن دلایل پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام لوگ نئے عقاید کے معاملے میں حد درجہ ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر یہ عقاید، اکثر عقاید (خواہ وہ نئے ہی کیوں نہ ہوں) سے ٹکراتے ہوں۔ اور یہ عقاید وہ ہیں جو حکمراں طبقوں کے عام مفادات سے سماجی مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ بات مذاہب اور کلیسا کی تاریخ میں اس کے زیر و بم میں نظر آجائے گی۔ کوئی مذہب یا چرچ اس حد تک معتقد لوگوں کی اپنی برادری کو برقرار رکھتا ہے (عام تاریخی ارتقائی ضرورت کی خاص حدوں کے اندر) جس حد تک وہ اپنے عقیدے کو مستقل اور منظم طور پر زندہ رکھتا ہے۔ اور انتھک طور پر معذرت خواہوں کے دلایل اور بیانات کو دہراتا رہتا ہے، ایک قسم کے دلائل سے لڑتا رہتا ہے اور دانشور عمائدین کے ایک بالائی حلقے کو برقرار رکھتا ہے، وہ دلائل جو عقیدے میں خیال و فکر کا ایک خاص بھرم قائم کرتے ہیں۔ جب کبھی سیاسی وجوہ کی بنا پر یہ متذکرہ رشتہ شدت سے مجروح ہوا ہے یا ٹوٹا ہے، جیسا کہ فرانسیسی انقلاب کے وقت ہوا تو، کلیسا کو بے اندازہ صدمہ پہنچا ہے۔ اور اگر وہ حالات، جن میں مروجہ معمولات پر عمل درآمد مشکل ہے، بعض حدوں سے زیادہ طول کھینچتے تو اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں یہ زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوتا اور ایک نیا مذہب ابھرتا، جیسا در حقیقت فرانس میں ہوا جب نیا مذہب تہذیبی آفاقیت کے امتزاج سے ابھرا۔ ہر وہ تہذیبی تحریک، جو عقلِ سلیم کی جگہ اور عام طور پر سابقہ تصوراتِ عالم کی جگہ لینا چاہتی ہے بعض بنیادی نتائج اخذ کر سکتی ہے (۱) اپنے دلائل کو دہرانے کا سلسلہ کبھی بند نہ کر۔ ہاں اس کی ہئیت بدلی جا سکتی ہے ــــ کسی خیال کو بار بار دہرانا عام لوگوں کو متاثر کرنے کا بہت ہی کارآمد اور بصیرت افروز حربہ ہے (۲) مستقل پھیلتے ہوئے عوام کے حلقے کی دانشورانہ سطح کو اوپر اٹھانے کے لیے انتھک کام کیا جائے، یعنی بے ہنگم جمِ غفیر میں شخصیت ساز خط و خال ابھارے جائیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک نئی قسم کا دانشوروں کا عملہ تیار کیا جائے جو براہِ راست عوام کے درمیان سے ابھرے ہوں۔ اب بھی ان کا رابطہ عوام سے قائم ہو اور جو "اندرونی ٹیک" کا کام کرے۔ یہ دوسرا لازمہ اگر پورا ہو جائے تو پھر یہ وہ عنصر بن جاتا ہے جو ایک عہد کے "نظریۂ کائنات" کو واقعی بدل دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ عملے اس وقت تک تشکیل و نشو نما نہیں پا سکتے، جب تک کہ ان کی صفوں میں رسوخ و اختیار کا بالائی ادارہ تشکیل نہ پائے، ایسا ادارہ جس میں دانشورانہ پرکاری ہو جو غیر منظم منفرد فلسفی میں مرکوز و عیاں ہو سکے۔ جو یہ سمجھ سکے کہ عام لوگ ایک انفرادی ذہن کی تیزی اور چستی نہیں رکھتے اور اس طرح ایک ایسے ڈھنگ سے اجتماعی نظریے کی باضابطہ توضیح میں کامیاب ہوں جو ایک اجتماعی مفکر کے خیال کے سانچوں سے زیادہ سے زیادہ قریب اور مطابق ہو۔

یہ بات صاف ہے کہ جمِ غفیر کے پیمانے پر ترکیب و تشکیل کسی نظریے کے پرچم تلے "مطلق العنان" ڈھنگ سے نہیں ہو سکتی، کسی ایک شخصیت یا گروہ کے رسمی تعمیری عزم کے اظہار سے، جو محض اپنے فلسفیانہ یا مذہبی عقاید سے مجنونانہ وابستگی کی بنا پر سرگرمِ عمل ہے۔ کسی بھی نظریۂ حیات کی موافقت یا مخالفت ایک ایسا وسیلہ ہے جس کی مدد سے فکر کے پیمانوں کی عقلیت یا تاریخیت پرکھی تنقیداً اپنے آپ کو آشکار کرتی ہے۔ من مانے نظریات کم و بیش تیز رفتاری سے تاریخی مقابلے کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان کو کسی حد تک جو مقبولیت نصیب ہوتی ہے اس کے باوجود ایسا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے فوری حالات کے موافق امتزاج کی بدولت۔ لیکن، دوسری طرف، ایسے نظریات جو ایک پیچیدہ اور منظم تاریخی عہد کے مطابق ہوں ہمیشہ حاوی ہوتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ ہاں ممکن ہے کہ ان کو پہلے چند عبوری مرحلوں سے گزرنا پڑے جن میں وہ انجام کار عجیب و غریب آمیزشوں کے باوجود وہ اپنا وزن اور برتری منوا لیتے ہیں۔

یہ حالات و واقعات بہت سے مسائل پیدا کرتے ہیں جن میں اہم ترین مسئلہ وہ ہے جو مختلف نوع کے دانشور حلقوں کے درمیان رشتے کی نوعیت اور کیفیت کے عنوان کے تحت آتا ہے، یعنی، اس عملی حصے کی اہمیت جو اوپر کے

گروہوں کی تخلیقی دین ہوتا ہے اور جو تنظیمی تاب و تواں کے سلسلے میں مباحث اور دانشورانہ طور پر تابع طبقے کی خاطر نئے تنقیدی تصورات کو اجاگر کر کے ادا کرتے ہیں۔ اس لیے نکتہ یہ ہے کہ بحث و تمحیص اور تبلیغ و اشاعت کی حدیں مقرر کی جائیں ایسی آزادی جس کو تادیبی نظم و ضبط کی نظر سے اور طاقت و اختیار کے آلۂ کار کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے بلکہ خود عائد کردہ حدوں کے روپ میں دیکھا جائے۔ ایسی حدیں جو رہنما خود اپنی سرگرمی پر عائد کرتے ہیں یا زیادہ مناسب الفاظ میں، تہذیبی پالیسی کا رُخ متعین کرنے میں اپنے اوپر عائد کرتے ہیں: دوسرے الفاظ میں: "علم و فضل کے قوانین، کون طے کرے گا، کون سائنسی چھان بین کی حدیں مقرر کرے گا، اور کیا یہ قوانین اور ان کی حدیں مناسب ڈھنگ سے متعین ہو سکتی ہیں؟ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نئی صداقتوں کی تلاش اور خود صداقتوں کی بہتر از زیادہ مربوط اور واضح ترتیب و ترکیب کا کام انفرادی عالموں کی پیش قدمی پر چھوڑ دینا چاہیے، خواہ وہ بحث و تمحیص کے دوران میں بظاہر بہت ہی بنیادی اصولوں کی جگہ دوسرے اصولوں کی ترتیب کریں۔ اس کے علاوہ اس بات کی وضاحت مشکل نہیں ہو گی کہ اس قسم کی بحث و تمحیص میں مفاد پرست رجحانات و مقاصد شامل ہو جاتے ہیں جن کا کوئی تعلق سائنسی کردار سے نہیں ہوتا۔ یہ تجویز پیش کرنا ناممکن نہیں ہے کہ انفرادی خیالات منظم اور منضبط ہو سکتے ہیں اور ان کو طرح طرح کے اخلاقی اور تہذیبی اداروں کی چھلنی میں چھان کر صاف کیا جا سکتا ہے۔ صرف اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ان کو منظر عام پر لانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

صاف صاف اور چبھتے انداز میں اس بات کا مطالعہ دلچسپ ہو گا۔ ہر ملک کے لیے اپنے سانچے ہوں گے۔ اپنی تہذیبی تنظیم جو نظریاتی دنیا کو متحرک رکھے گی۔ صرف اس معنی میں اس کے عملی کام کو پیش نظر رکھا جائے۔ مختلف ملکوں کی آبادی کے ساتھ ایسے عملے کے تنظیمی رشتے کا مطالعہ جو اپنے پیشے کے لحاظ سے سرگرم تہذیبی کام میں منہمک ہے، کافی مفید ہو گا۔ ساتھ ہی اس کی آزاد قوتوں کا اندازہ لگانا بھی کارآمد ثابت ہو گا۔ اسکول ہر سطح پر، اور چرچ، ہر ملک میں، دو بڑے تہذیبی ادارے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی تعداد کو پیش نظر رکھیں جو یہاں سرگرم عمل ہیں، ان کے علاوہ ان کے اخبار ہوتے ہیں، تبصرے اور کتابیں ہوتی ہیں، نجی علمی ادارے ہوتے ہیں، خواہ وہ ریاستی اسکول سے منسلک ہوں یا "پاپولر یونیورسٹیوں" جیسے ادارے ہوں دوسرے پیشے بھی اپنی خاص الخاص سرگرمیوں میں ایسی تہذیبی سرگرمیوں کو شامل کرتے ہیں جن کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، قانون داں اور دیگر حکام وغیرہ۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہونی چاہیے کہ تمام ملکوں میں، مختلف حدوں تک ہی سہی، جم غفیر اور دانشور گروہوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل رہتی ہے۔ جن میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو قوم سے قریب ترین واسطہ رکھتے ہیں۔ مثلاً استاد اور پادری۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ جہاں حکمراں افراد زبانی طور پر اس کا اعادہ کرتے ہیں، ریاست کے پاس کوئی وحدت الوجود، مربوط اور یکساں تصور نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے دانشور مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور پھر گروہ اندر ہی اندر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کچھ ملکوں کو چھوڑ کر کسی قسم کا اتحاد پیدا کرنے والا اثر نہیں ڈالتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آزاد مفکر پوری یونیورسٹی سے زیادہ اثر و انداز تاثر انگیز ہوتا ہے۔

مارکسزم کی ایسی تاویل کے سلسلے میں جس میں مقدر پرستی کی چھاپ ہوتی ہے، عرض ہے کہ ایسی تفسیر و تاویل کو دور سے سلام، کیوں کہ اس کی افادیت ایک خاص تاریخی دور میں کسی قدر ہوتی ہے مگر اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی مقدر پرستانہ تاویل کو جلد از جلد نہایت احترام و ادب کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ اس کی مثال تقدیر و رحمت و شفاعت کی نظریے سے دی جا سکتی ہے۔ جدید دنیا کی شروعات کی تان بہرحال کلاسیکی جرمن فلسفے پر ٹوٹی جس کی آزادی کا تصور دراصل ضرورت کا ادراک ہے۔ یہ فضول عام نعرہ ہے جس نے "خدا کی مرضی" کی جگہ لے لی ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اپنی ابتدائی اور

دنیاوی سطح پر بھی، یہ اس تصور کا آغاز تھا جو "خدا کی مرضی" یا خدا کی رحمت والے تصور سے زیادہ جدید اور شاداب و زرخیز تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نیا تصور اپنے آپ کو گنواروں کے عامیانہ لب و لہجے کے علاوہ کسی اور پیرہن میں ڈھال کر اپنے ظہور کا اعلان کرے؟ پھر بھی یہ طے ہے کہ مورخ تمام پیش بینیوں اور مستقبل کی بصیرت سے لیس ہو کر، ایک نئی دنیا کی شروعات کے ادراک و عرفان میں کاہیا ہوتا ہے۔ ایک ایسی نئی دنیا کی شروع میں ہمیشہ کھردری اور سنگلاخ ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ یہ اس زوال آمادہ دنیا کے مقابلے میں برتر و مبارک ہے جو چراغِ سحر کی طرح لَو پھٹنے سے پہلے جھلملاتی ہے اور کبھی کبھی بھڑک کر خس و خاشاک کو روشن بھی کر دیتی ہے۔

بے حسی : انتونیو گرامچی

بے حسی حقیقتاً ایک موثر تاریخی قوت کی حیثیت رکھتی ہے، مگر منفی معنی میں۔ جو کچھ پیش آتا ہے، چاہے وہ ایسی بدی ہو، جو کبھی پر اثر انداز ہوتی ہے یا چاہے وہ ایسی ممکنہ نیکی ہو، جو کسی عمومی جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ ہو ——— وہ چند فعال افراد کی پہل قدمی کا اتنا نتیجہ نہیں ہوتا، جتنا کہ وہ کثیر افراد کی بے حسی، عدم شرکت کا حاصل ہوتا ہے۔ جو کچھ پیش آتا ہے، اس کا بڑا سبب یہ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں، بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شہریوں کی بڑی اکثریت اپنی ذمہ داری کو تج دیتی ہے اور جو کچھ ہوتا ہے، اُسے ہونے دیتی ہے۔ وہ ایسی گتھائیں پڑنے دیتے ہیں، جنھیں وقت گزرنے کے بعد تلوار سے ہی کاٹا جا سکتا ہے؛ وہ ایسے افراد کو اقتدار پر قابض ہونے دیتے ہیں، جنھیں وقت گزرنے پر صرف بغاوت کے ذریعہ ہی ہٹایا جا سکتا ہے۔ تاریخ پر جو قسمت پرستی حاوی نظر آتی ہے، دراصل وہ اسی بے حسی، اسی عدم شرکت کا پرتو ہے۔ واقعات سائیوں میں پروان چڑھتے ہیں۔ چند ہاتھ جو کسی کے بھی سامنے جواب دہ نہیں ہوتے، اجتماعی زندگی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ عوام النّاس کو ان واقعات کی اصلیت کا کبھی علم نہیں ہو پاتا۔ ایک عہد کی قسمت کا فیصلہ نہایت تنگ مفادات کے افق کو، فعال افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے فوری مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کیا جاتا ہے اور عوامُ النّاس اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ مگر جو واقعات سائیوں میں پروان چڑھتے ہیں، وہ سامنے آجاتے ہیں؛ سائیوں میں بُنا گیا پارچہ تکمیل پاتا ہے اور ہر سُو ہر فرد پر یہ احساس طاری ہو جاتا ہے کہ بس یہی ہونا تھا اور یہی ہو کر رہا۔ اس وقت ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ تاریخ ایک مافوق الفطرت قدرتی وقوعہ ہے، ایک اُبال ہے، ایک زلزلہ ہے اور ہم سب اس کے صید لاچار ہیں، وہ بھی جو اس وقوعہ کے خواہش مند تھے اور وہ بھی جو اس کے آرزومند نہیں تھے۔ وہ بھی جو فعال تھے اور وہ بھی جو بے حس تھے۔ اور پھر وہی بے حس لوگ برافروختہ ہوتے ہیں اور نتائج سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ان کی قطعی یہ خواہش نہیں تھی کہ ایسا ہوتا، اس لیے وہ اس کے لیے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ کچھ لوگ بڑی بیچارگی کے عالم میں ماتم کرتے ہیں اور کچھ لوگ اُونچے سُروں میں آہ و بکا کرتے ہیں مگر ایسے افراد کم ہی ہوتے ہیں، جو خود سے یہ دریافت کریں: 'اگر مَیں نے فرد کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیا ہوتا، اگر مَیں نے اپنی آواز بلند کی ہوتی، اپنی رائے کا اظہار کیا ہوتا تو کیا وہ ہوتا، جو ہوا ہے؟' لیکن ایسے افراد کم ہی ہوتے ہیں، جو اپنی بے حسی، اپنی قنوطیت کو موردِ الزام گردانیں، اُن سیاسی اور معاشی گروہوں کو اخلاقی اور مادّی مدد دینے میں اپنی ناکامی کو ذمہ دار تسلیم کریں، جو کسی مخصوص بدی سے بچنے یا کسی مخصوص نیکی کو فروغ دینے کے لیے کوشاں تھے۔ اس کے برعکس، ایسے لوگ نظریات کی ناکامی، منصوبوں کی ناگزیر شکست اور ایسی ہی باتوں سے اپنا دل بہلانے لگتے ہیں۔ ان کی بے حسی اور قنوطیت بدستور جاری و ساری رہتی ہے۔ کل سے وہ ایک بار پھر واقعات کے لیے براہ راست یا بلاواسطہ ذمہ داری

سے دست بردار رہنے کی زندگی جینے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حالات سے لاعلم ہوتے ہیں یا وہ سنگین ترین مسائل کے نہایت شاندار حل پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مگر یہ حل شاندار طریقے سے بانجھ ہی رہتے ہیں۔ اخلاقی حس کی کوئی چنگاری ان لوگوں کو اجتماعی زندگی میں حصّہ لینے پر آمادہ نہیں کرتی، بلکہ یہ لوگ اجتماعی زندگی کو ذہنی عیّاشی کا محض ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان میں تاریخی ذمہ داری کے احساس کا قطعی فقدان ہوتا ہے، جو افراد کو زندگی میں فعّال کردار ادا کرنے پر انگیخت کرتا ہے، جو کسی قسم کی بے یقینی یا بے حسی کی گنجایش نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ، ہر شخص نہ صرف اس کے لیے جواب دہ ہے، جو اُس نے کیا ہے، بلکہ خصوصی طور پر اس کے لیے بھی جواب دہ ہے، جو اُس نے نہیں کیا۔

——— "ادانتی" متوازن ایڈیشن

۲۶ اگست ۱۹۱۶ء

عبقریوں کے وجود کا سلسلۂ عمل

کیا عبقری ایک خود مختار اور آزاد سماجی گروہ ہوتے ہیں یا ہر ایک سماجی گروہ کا اپنا الگ اور مخصوص عبقریوں کا گروہ ہوتا ہے؟ یہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہے، کیونکہ تاریخی طور پر عبقریوں کی مختلف اقسام آج تک نہایت مختلف اشکال میں وجود میں آئی ہیں۔

ان میں سے دو اشکال نہایت اہم ہیں:

۱۔ ہر ایک سماجی گروہ، جو معاشی پیداوار کی دنیا میں بنیادی فریضہ ادا کرتے ہوئے عالم وجود آتا ہے، اپنے ساتھ ساتھ organically —— عبقریوں کا ایک یا ایک سے زیادہ گروہ وجود میں لاتا ہے، جو اسے ربط عطا کرتے ہیں اور نہ صرف معاشی، بلکہ سماجی اور سیاسی شعبوں میں بھی اسے اس کے مقام کا شعور عطا کرتے ہیں۔ سرمایہ دار، کارخانے دار — اپنے ساتھ صنعتی ٹیکنیشین کو، سیاسی معیشت (Political Economy) کے ماہر کو، ایک نئی ثقافت کے تنظیم کار کو اور ایک نئے قانونی نظام کے تنظیم کار کو بھی وجود میں لاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سرمایہ دار، کارخانے دار بھی سماج کے فروغ کی ایک اعلیٰ ترسطح کا ترجمان ہوتا ہے، جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی حد تک اس کی پہلے سے عملداری قائم ہو چکی ہوتی ہے اور وہ ٹیکنیکل (دوسرے لفظوں میں دانشورانہ) صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے؛ اس کے لیے ایک حد تک ٹیکنیکل صلاحیت حاصل کرنا از بس ضروری ہوتا ہے، صرف اپنی سرگرمی اور پہل کے محدود شعبہ میں ہی نہیں، بلکہ دوسرے شعبوں میں بھی، کم سے کم ان شعبوں میں، جو معاشی پیداوار کے شعبے سے قریبی علاقے رکھتے ہیں؛ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عوام کے جم غفیر کو منظم کرے؛ اپنی تجارت میں سرمایہ لگانے والوں کے اعتماد کا تنظیم کار بنے، لوگوں میں اپنی مصنوعات کے لیے اعتماد منظم کرے وغیرہ۔

اگر سبھی سرمایہ دار کارخانے دار نہیں تو کم سے کم ان میں سے ایک سربرآوردہ طبقہ میں عام سماج کو منظم کرنے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے، جس میں خدمات عامہ کا پیچیدہ نظام اور ریاستی نظام بھی شامل ہے، کیونکہ ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے طبقہ کی توسیع و ترقی کے لیے سازگارترین حالات پیدا کریں؛ یا کم سے کم ان میں ایسے نمائندوں (خصوصی مہارت رکھنے والے ملازمین) کو چننے کی صلاحیت ہونی چاہیے جو تجارت سے خارج کی دنیا میں تعلقات کے عام نظام کو منظم کرنے کا کام انجام دے سکیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ "organic" —— عبقری، جنھیں ہر ایک نیا طبقہ اپنے ساتھ تخلیق کرتا ہے اور فروغ کے دوران جس کے خدوخال وضع ہوتے ہیں، وہ اکثر ان ابتدائی مراحل کی سرگرمیوں کے جزوی پہلوؤں پر ہی مہارت رکھتے ہیں، جو نئے طبقہ کے ساتھ عالم وجود میں آتی ہیں۔

جاگیردار، نواب تک بھی خصوصی ٹکنیکل (فوجی) صلاحیت رکھتے تھے اور ٹھیک اس لمحے سے جبکہ طبقہ اشرافیہ

تکنیکی، خوبی صلاحیت پر اپنی اجارے داری سے محروم ہوتا ہے، جاگیر دارانہ نظام کے بحران کی شروعات ہو جاتی ہے مگر جاگیر دارانہ دنیا میں عبقریوں کا وجود میں آنا اور ان کا اس سے قبل کی کلاسیکی دنیا میں وجود میں آنا، ایک ایسا سوال ہے جس کا الگ سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ لاتعداد کسان اگرچہ پیداوار کی دنیا میں ایک بنیادی فریضہ انجام دیتے ہیں، مگر وہ اپنے "نمائندہ" عبقریوں کو وجود میں نہیں لاتے اور نہ کسان روایتی عبقریوں کے کسی حصہ کو اپنے اندر "جذب" ہی کرتے ہیں، حالانکہ دوسرے سماجی گروہ کسان طبقہ سے متعدد عبقریوں کو نکال کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور روایتی عبقریوں کی ایک بڑی تعداد دہقان الاصل ہی ہوتی ہے۔

۲ - ہر ایک "اساسی" سماجی گروہ، جو سابقہ معاشی ڈھانچہ سے تاریخی طور پر فروغ پا کر ظہور پذیر ہوتا ہے، اور اس ڈھانچہ میں تبدیلی کے اظہار کے طور پر، عبقریوں کی مختلف اشکال کو پہلے سے موجود پاتا ہے (کم سے کم تاریخ میں اب تک تو یہی ہوتا آیا ہے) تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک ایسا تاریخی تسلسل ہے، جس کی سیاسی اور معاشرتی اشکال میں نہایت پیچیدہ اور دور رس تبدیلیاں بھی حارج نہیں ہوتیں۔

عبقریوں کی ان اقسام کی سب سے اہم مثال پادری، پجاری ہیں، جن کی تاریخ کے ایک طویل دور میں، کئی اہم خدمات پر اجارے داری رہی ہے: مذہبی نظریہ یعنی عہد کے فلسفہ اور سائنس اور اس کے ساتھ مدارس، تعلیم، اخلاق، انصاف، خیرات، رفاہی کاموں وغیرہ پر ان کی اجارے داری رہی ہے۔ ان مذہبی ہادیوں کو ایسے عبقری سمجھا جا سکتا ہے، جو زمیندار طبقہ اشرافیہ سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان عبقریوں کو قانونی سطح پر طبقہ اشرافیہ کے برابر کا درجہ حاصل تھا جس کے اشتراک میں عبقریوں کے طبقہ کو وہ عام ریاستی امتیازات بھی حاصل تھے، جو جائداد کی دین ہوتے ہیں۔ (زمانہ قدیم کے معاشروں میں ثانوی طور پر علاج معالجہ کرنے والوں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بھی یہ امتیازات حاصل رہے ہیں) مگر پادریوں، پجاریوں کی اس اجارے داری کو مزاحمت یا تحدید سے بھی دوچار ہونا پڑا اور پادریوں، پجاریوں کی نئی اقسام کو فروغ حاصل ہوا، جنھیں بادشاہ کی مرکزی طاقت کی سرپرستی حاصل تھی، یہاں تک کہ شہنشاہ طاقتِ مطلق کے مالک بن گئے۔ اس طرح خلقی ہادی، سرکاری کارندوں کی ایک نئی قسم محقق اور سائنس داں، نظریہ ساز اور غیر مذہبی فلسفی عالم وجود میں آئے۔

یہ سبھی روایتی عبقری اپنے تاریخی تسلسل اور اپنے مخصوص علم کی بنا پر خود کو غالب سماجی گروہ سے الگ، آزاد اور خود مختار گروہ سمجھنے لگتے ہیں۔ خود اپنی قدر و قیمت کا تعین نظریاتی اور سیاسی شعبوں میں کئی اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ پورے آدرش وادی فلسفہ میں اس موقف کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، جو اس قسم کے عبقری اختیار کرتے رہے ہیں اور اس معاشرتی اٹوپیا کے اظہار کے طور پر اس کی تشریح کی جا سکتی ہے، جس کے زیر اثر یہ عبقری خود کو "آزاد" "خود مختار" اور خود کو مخصوص کردار سے بہرہ ور سمجھنے لگتے ہیں۔ . .

. . . "عبقری" کی اصطلاح کی انتہائی حدود کیا ہیں؟ کیا ہم کوئی ایسا پیمانہ تلاش کر سکتے ہیں جس کا عبقریوں کی نہایت مختلف النوع اور متضاد سرگرمیوں پر یکساں طور پر اطلاق ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے سماجی گروہوں کی سرگرمیوں سے بنیادی طور پر انھیں ممیز کیا جا سکے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت عام غلطی رہی ہے کہ دانشورانہ سرگرمیوں کی ماہیت میں ہی اس امتیاز کے پیمانہ کو تلاش کیا جاتا رہا ہے، جبکہ یہ پیمانہ تعلقات کے اس نظام میں تلاش کیا جانا چاہیے، جس کے معاشرتی تعلقات کے پیچیدہ جال کی حدود میں یہ سرگرمیاں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ مثال کے لیے ایک کارکن یا پرولتاری کی امتیازی خصوصیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ ہاتھوں یا اوزاروں سے کام کرتا ہے، بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ

خاص حالات میں اور مخصوص معاشرتی تعلقات کے چوکھٹے میں کام کرتا ہے۔ (علاوہ ازیں خالص جسمانی مشقت کوئی وجود نہیں رکھتی ۔ ۔ ۔ جسمانی مشقت کے کسی بھی کام میں، چاہے وہ ارذل ترین اور نہایت میکانکی ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ تکنیکی مہارت درکار ہوتی ہے اور یہ تخلیقی دانش ورانہ سرگرمی کا ہی نتیجہ ہوتی ہے) اور جیسا کہ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ سرمایہ دار، کارخانے دار کے لیے اپنی سرگرمی کے طفیل، کسی حد تک دانشورانہ خوبیوں کا حامل بننا ضروری ہے، حالانکہ معاشرہ میں اس کے کردار و حیثیت کا تعین ان سے نہیں ہوتا، بلکہ ان عمومی معاشرتی تعلقات سے ہوتا ہے، جو میدان صنعت میں سرمایہ دار، کارخانے دار کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سبھی انسان عبقری ہوتے ہیں، مگر سماج میں سبھی آدمی عبقریوں کا کردار ادا نہیں کرتے۔ (مثلاً ہر آدمی کبھی نہ کبھی انڈے تل لیتا ہے یا پھٹے ہوئے جیکٹ کو سی لیتا ہے، مگر ضروری نہیں ہوتا کہ ہم اس آدمی کو باورچی یا درزی سمجھنے لگیں)

جب ہم دانشور اور غیر دانشور میں امتیاز کرتے ہیں تو درحقیقت ہمارے ذہن میں عبقریوں کی پیشہ ورانہ معاشرتی سرگرمی کا خیال ہی جاگزیں ہوتا ہے یعنی ہمارے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ ان کی مخصوص پیشہ ورانہ سرگرمی کا جھکاؤ کس طرف ہے، ذہنی کدوکاوش کی طرف یا عضلاتی - اعصابی کدوکاوش کی طرف - اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم عبقریوں کا تذکرہ تو کر سکتے ہیں، مگر غیر عبقریوں کا تذکرہ نہیں کر سکتے کیونکہ غیر عبقریوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ فرذہنی، دماغی کدوکاوش اور عضلاتی، اعصابی کدوکاوش کے درمیان رشتہ ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا جس کی وجہ سے مخصوص دانشورانہ سرگرمیوں کی اقسام مختلف ہوتی ہیں یا انسانی سرگرمی کی کوئی ایسی شکل اپنا وجود نہیں رکھتی، جس سے ذہنی کدوکاوش کو یکسر خارج کیا جا سکے ——— آلات ساز انسان (Homo Fabre) کو مفکر انسان (Homo Sapiens) ——— سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ حتمی طور پر ہر ایک انسان، اپنی پیشہ ورانہ سرگرمی کے علاوہ، کسی نہ کسی دانشورانہ سرگرمی میں حصہ لیتا ہے یعنی وہ "فلسفی" ہوتا ہے، ایک فنکار ہوتا ہے، ذوق سلیم رکھنے والا فرد ہوتا ہے، وہ دنیا کے ایک خاص تصور میں حصہ دار ہوتا ہے، وہ شعوری طور پر اخلاقی برتاؤ کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے اور چنانچہ، وہ دنیا کے ایک تصور کو جاری و ساری رکھنے یا اس میں تبدیلی لانے میں مدد دیتا ہے یعنی وہ فکر کے نئے انداز وجود میں لاتا ہے۔

عبقریوں کے ایک نئے گروہ کو وجود میں لانے کا مسئلہ دراصل اس میں مضمر ہے کہ اس دانشورانہ سرگرمی کو جو سب میں ترقی کے کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہوتی ہے، انتقادی طور پر کس طرح فروغ دیا جائے اور عضلاتی، اعصابی کدوکاوش سے اس کے رشتے کو بدل کر اس میں کس طرح ایک نیا توازن لایا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ عضلاتی، اعصابی کدوکاوش جہاں تک وہ اس عمومی عملی سرگرمی کے ایک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، جو مادی اور معاشرتی دنیا میں مسلسل تغیرات لاتی ہے ——— دنیا کے ایک نئے اور ہمہ گیر تصور کی بنیاد بن جائے۔ خود کو محض ادیب، خالص فلسفی یا فنکار سمجھنے والے دراصل عبقریوں کی روایتی اور بھونڈی مثال ہیں۔ چنانچہ صحافی بھی، جو ادیب، فلسفی، فنکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، خود کو "حقیقی" عبقری سمجھتے ہیں۔ جدید دنیا میں تکنیکی تعلیم ہی جو چاہے نہایت غیر ترقی یافتہ اور غیر مہارتی سطح کی صنعتی محنت سے ہی کیوں نہ جڑی ہوئی ہو، نئی قسم کے عبقری کے وجود کی اساس ہونی چاہیے۔

(اقتباس)

" عبقریوں کے وجود کا سلسلۂ عمل "

طبقے، ریاست، پارٹیاں : انتونیو گرامچی

سوشلسٹ نقطۂ نظر سے، ریاست کس کی ترجمانی کرتی ہے؟ ریاست بورژوا طبقہ کی معاشی، سیاسی تنظیم ہوتی ہے۔ ریاست بورژوا طبقہ کا جدید، ٹھوس مظہر ہے۔ ریاست سے باہر بورژوا طبقہ ایک متحد جماعت نہیں ہوتا۔ آزاد مسابقت کے نتیجہ میں نظام کی معاشی صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لیے سرمایہ داروں کے نئے گروہ مسلسل وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ان میں ہر ایک گروہ خوں آشام مسابقت سے خود کو الگ کرنے اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا کوشاں ہوتا ہے۔ ریاست کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اندرونی طبقاتی قضیوں اور مخالف مفادات کی آویزشوں کا قانونی تصفیہ وحل تلاش کرے اس طرح ریاست مختلف گروہوں کو متحد کرتی ہے حکراں طبقہ کو ایک ٹھوس اور متحد خارجی رُوپ عطا کرتی ہے۔ گروہوں کے درمیان مسابقت حکومت کے نکتہ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ سب سے طاقتور بورژوا پارٹی یا اُن کی گروہ بندی حکومت پر قابض ہوتی ہے، موخر الذکر کی طاقت کی وجہ سے اُسے ریاستی اقتدار کو استعمال کرنے، اُسے کسی خاص سمت میں موڑنے اور اپنے معاشی اور سیاسی پروگرام کے مطابق اسے کسی وقت بھی آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

بورژوا پارٹیاں پیداواری مفادات کی ترجمان ہوتی ہیں یا وہ ایسی مکھیوں کا غول ہوتی ہیں، جو گاڑی سے چپٹے رہنے کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ گاڑی اُن کی طاقت کے بل بوتے پر ہی پہاڑی پر چڑھ رہی ہے۔ یہ مکھیوں کا یہ غول ریاست کے ڈھانچے پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہوتا لیکن مکھیوں کا یہ غول خوب الفاظ بھنبھناتا ہے اور خویش پروری کا شہد چوستا ہے۔

سوشلسٹ پارٹی گروہی نہیں، بلکہ ایک طبقاتی تنظیم ہوتی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی دوسری پارٹیوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ریاست کو، جو بورژوا طبقہ کے اقتدار کا ڈھانچہ ہوتی ہے، اپنا مخالف مماثل ہی سمجھ سکتی ہے۔ وہ خود کشی کیے بغیر، اپنی ماہیت سے محروم ہوئے بغیر، ایک ایسا سیاسی گروہ بنے بغیر، جو پرولتاریہ کی تاریخی کردار سے بیگانہ ہو چکا ہو، ایسی مکھیوں کا غول بنے بغیر، جو شیرہ کے طشت سے چپکنے اور اس میں جان دینے کے لیے بے قرار ہو —— ریاستی اقتدار جیتنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ مسابقت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ سوشلسٹ پارٹی ریاستی اقتدار کے حصول کے لیے کوشاں نہیں ہوتی؛ وہ اس کی جگہ لینے کی کوشاں ہوتی ہے، یہ حکومت کو بدلتی ہے، پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کرتی ہے اور آزادانہ مسابقت کی جگہ پیداوار اور تبادلے کی تنظیمِ نو کو عمل میں لاتی ہے۔

—— الگرید وحیل پوپولو

۱۸ مئی ۱۹۱۸ء

عضویاتی بحران کے ادوار میں سیاسی پارٹیوں کے چند پہلوؤں کا جائزہ

اپنے تاریخی وجود کے کسی مرحلہ پر معاشرتی طبقات اپنی روایتی پارٹیوں سے الگ تھلگ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان روایتی پارٹیوں کو . . . خود اُن کا طبقہ یا اس کا ایک حصہ اپنا نمائندہ تصور کرنا ترک کر دیتا ہے۔ جب ایسا بحران پیدا ہوتا ہے تو فوری صورت حال نازک اور خطرناک بن جاتی ہے، کیونکہ پُر تشدد حلوں کے لیے راہ کھُل جاتی ہے اور راہ کھلتی ہے ایسی نامعلوم طاقتوں کی سرگرمیوں کے لیے، جن کی ترجمانی کوئی "کرشماتی شخصیت" کرتی ہے۔

نمائندوں کو چننے والوں اور چنے جانے والے نمائندوں کے درمیان آویزش کی یہ صورت حال پارٹیوں کی صفوں میں بھی پھوٹتی ہے (پارٹی تنظیموں میں، پارلیمانی انتخابی میدان میں، اخباری تنظیم کے معاملے میں) اور پورے ریاستی نظام کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، جو نوکر شاہی (شہری اور فوجی) اعلیٰ سطح کی سرمایہ کاری، چرچ اور عمومی طور پر ان سبھی اداروں کی نسبتی قوت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے، جو رائے عامہ کے اتار چڑھاؤ سے نسبتاً محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ ہر ایک ملک میں یہ سلسلہ عمل مختلف ہوتا ہے، مگر اس کی ماہیت یکساں ہوتی ہے۔ اور یہ ماہیت ہوتی ہے برسر اقتدار طبقہ کی عملداری کا بحران جو اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ برسر اقتدار طبقہ کسی ایسے بڑے سیاسی فریضے کی انجام دہی میں ناکام رہا ہے، جس کے لیے اس نے عوام الناس کی رضامندی حاصل کی ہے یا انھیں زبردستی یہ رضامندی دینے پر مجبور کیا ہے (مثلاً جنگ کے لیے) یا عوام الناس (خصوصاً کسان اور پیٹی بورژوا دانشور) سیاسی عدم تحرک کی حالت کو ترک کر کے اچانک سرگرم عمل ہو گئے ہیں اور وہ ایسے مطالبات کرنے لگے ہیں جو ربط و آہنگ سے ملو صورت گری سے محروم ہونے کے باوجود، انقلاب کا سا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ "حاکمیت کے بحران" کی چرچا ہونے لگتی ہے، یہ درحقیقت عملداری کا بحران ہوتا ہے یا ریاست کا عمومی بحران۔

یہ بحران ایسے حالات کو جنم دیتا ہے، جو فوری طور پر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، کیونکہ عوام کے مختلف طبقات تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق اپنے رویّہ میں اتنی ہی تیزی کے ساتھ تبدیلی لانے یا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اپنی تنظیم نو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ روایتی برسر اقتدار طبقہ، جس کے پاس متعدد تربیت یافتہ کارندے ہوتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ رہنماؤں اور پروگراموں کو بدلتا ہے، جتنی تیزی کے ساتھ مغلوب طبقات اپنے رویّہ میں تبدیلی نہیں کر پاتے اور برسر اقتدار طبقہ عنانِ حکومت پر اپنی گرفت کو پھر مضبوط کر لیتا ہے، جو ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے یہ برسر اقتدار طبقہ کچھ قربانیاں دینے کے لیے بھی تیار ہو جائے اور عوام الناس کو خوش کرنے کے لیے لمبے چوڑے کھوکھلے وعدے بھی کر ڈالے، مگر طاقت اس کے ہی ہاتھ میں رہتی ہے اور فی الوقت برسر اقتدار طبقہ اس طاقت میں اضافہ بھی کرتا ہے اور وہ اس طاقت کو اپنے مخالف کو کچلنے اور ممتاز کارکنوں کو تتر بتر کرنے کے

لیے بھی استعمال کرتا ہے، جو بہر حال کثیر التعداد یا اعلیٰ تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ مختلف پارٹیوں کے لوگ ایک ہی پارٹی کے پرچم تلے جمع ہو جاتے ہیں، جو اپنے طبقہ کی نمائندگی بہتر طور پر کرنے لگتی ہے اور اس پورے طبقہ کی ضروریات کی ایک بار پھر تکمیل کرنے لگتی ہے۔ یہ ایک عضوی اور نارمل صورت حال ہی کہی جا سکتی ہے، حالانکہ تبدیلی کی رفتار نہایت تیز ہوتی ہے۔ پُرسکون ادوار کے مقابلے میں اس تبدیلی میں بجلی کی سی سُرعت ہوتی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی ترجمان ہوتی ہے کہ ایک پورا معاشرتی طبقہ واحد لیڈر شپ کے تحت مرتکز ہو گیا ہے، تنہا جسے اس طبقہ کے وجود کو در پیش مسائل کو حل کرنے اور اس کو در پیش سنگین خطرہ کا منہ موڑنے کا اہل سمجھا جانے لگا ہے۔ جب بحران کا عضوی حل نہیں نکلتا بلکہ بحران کا حل واحد کرشماتی لیڈر کی صورت میں نکلتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے ایک منجمد توازن پیدا ہو گیا ہے (جس کے عناصر مختلف النوع ہو سکتے ہیں، مگر جن میں فیصلہ کن عنصر ترقی پسند قوتوں کی ناپختگی ہوتی ہے) اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بھی گروپ، نہ قدامت پرست اور نہ ہی ترقی پسند، اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کو زیر کر سکے اور یہ کہ قدامت پرست گروہ کو بھی ایک ماسٹر کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ دیکھیے[1]: